قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی
1989

اس شمارہ میں

۱۔ لمعات۔ بنیادی حقوقِ انسانیت
۲۔ لاتنسیا فی ذِکری
۳۔ عید کی کہانی (بچوں کا صفحہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوع اسلام کے ایک بہی خواہ رمقطراز ہیں:

طلوع اسلام کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حال کی خرابیوں پر تنقید تو ہوتی ہے لیکن کوئی متبادل اسکیم سامنے نہیں رکھی جاتی۔ طلوع سلام ہمارا محبوب ترین مجلہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کی مقبولیت میں فرق آئے۔ لہٰذا آپ اس طرف ضرور توجہ دیں۔

چونکہ اس خط میں طلوع اسلام کے مسلک یا لائحہ عمل کے متعلق ایک اصولی چیز کو سامنے لایا گیا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا جواب نجی طور پر دینے کے بجائے' اسے طلوع اسلام کے صفحات ہی پر پیش کیا جائے تاکہ قارئین طلوع اسلام اس باب میں ہمارے موقف سے مطلع ہو جائیں۔

طلوع اسلام کے متعلق اکثر احباب کی طرف سے یہ شکایت یا مشورہ موصول ہوتا ہے کہ طلوع اسلام کوئی عملی کام نہیں کر رہا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ طلوع اسلام کو ایک جماعت بنانی چاہئے جو ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں عملاً حصہ لے اور جس مقصد کی طرف طلوع اسلام دعوت دیتا چلا آ رہا ہے اسے عملی طور پر قوم کے سامنے پیش کرے۔ اس باب میں ہم اشارۃً اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ اپنا مقصد واضح کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج کی نشست میں اس کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

ہماری ناکامیوں اور تباہ حالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم بڑے جذباتی ہو چکے ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور کوئی ایسا کام جس میں جذباتی تلاطم خیزیاں اور شور انگیزیاں نہ ہوں ہماری فطرت سیماب آسا کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہم ایک مدت کی جذبات پرستی سے اس کے خوگر ہو چکے ہیں کہ ایک ہنگامہ ہو' ایک جوش ہو' ایک خروش ہو' لچھے دار تقریریں ہوں' فلک بوس نعرے ہوں' سیل انگیز جلوس ہوں' بڑی بڑی انقلاب در آغوش اسکیمیں بنائی جائیں' آسمان الٹ دینے والے منشور شائع کئے جائیں' تہلکہ مچا دینے والے عزائم و مقاصد کا اعلان کیا جائے' اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو فریق مخالف کو گالیاں دے کر جیل خانہ ہو آئیں۔ بس اس کے بعد آپ کے باعمل ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں۔ یہی معراجِ مقاصد ہے۔ یہی منتہائے جہاد ہے اور یہ سب کچھ ایک پارٹی بنا کر کیا جائے۔ جماعت سازی اور گروہ بندی کے بغیر آپ باعمل ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ زندگی کی حرارت کا مقیاس ہی پارٹی بازی ہے۔

یہ ہے ''عمل'' کا وہ تصور جو ایک عرصہ سے قوم کے ذہن میں مرتسم کیا جا رہا ہے اور جس کے ذریعے قوم کے جذبات سے بری طرح کھیلا جا رہا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ کی گذشتہ تاریخِ سیاست میں کیسے کیسے دلفریب نعرے (Slogans) تھے جن سے قوم کے جذبات کو مشتعل کر کے اسے آگ کے شعلوں میں جھونک اور خون کی ندیوں میں دھکیل دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس دوران میں آپ کی قوم نے کس قدر جانی اور مالی قربانیاں دیں اور وہ تمام قربانیاں کس بری طرح سے رائیگاں گئیں۔ کتنے افراد ہیں جو ان بے نتیجہ قربانیوں کے ہاتھوں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کتنے خاندان ہیں جو ان جذباتی شعلہ فشانیوں کے بے معنی ہنگاموں سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ کتنے بچے ہیں جن کی نگہ پرداخت کرنے والے ان تلاطم انگیز بے مقصد تحریکوں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے اور ان کا آج کوئی والی اور وارث نہیں۔ کتنے گھر ہیں جن کے چراغ انہی جھکڑوں نے بجھا دیئے اور کتنے در ہیں جنہیں یہی آندھیاں اکھیڑ کر لے گئیں اور ان تمام بربادیوں اور تباہیوں کا ماحصل؟ فضا میں چند الفاظ سے پیدا کردہ وقتی ارتعاش اور سینوں میں چند نعروں سے ابھارا ہوا عارضی تموج۔ سوچئے کہ آپ کی بے شمار تحریکوں اور لاتعداد جماعتوں کے ''جہاد زندگی'' کا ماحصل اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ یہ تو یوں کہئے کہ قدرت کو ان چند کروڑ مسلمانوں کو بچانا مقصود تھا جو بساطِ سیاست کی آخری مہرہ بازی جناحؒ جیسے ٹھنڈے دماغ کے ہاتھ لگ گئی جس نے اس مردِ آخر بیں کے فکر صحیحہ کو یوں متشکل کر دکھایا جس کی مغفرت کے لئے عالمگیر کی مسجد جامع کے مینار شب و روز دست بدعا ہیں۔ ورنہ ہماری ہنگامہ خیز محفلوں کی یادگار آج سوائے خاکسترِ پروانہ کے اور کچھ بھی نہ ہوتی۔

طلوع اسلام کو فطرت کی کرم گستری نے یہ سمجھنے کی توفیق ارزانی فرما دی کہ قوموں کے حالات ہنگامہ خیزیوں اور تموج انگیزیوں سے نہیں بدلا کرتے۔ ان کی حالت میں کوئی تبدیلی مستقل طور پر پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی نہ پیدا ہو' خارجی دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا جب تک انسان کی داخلی دنیا میں انقلاب واقعہ نہ ہو جائے' کسی قوم کا معاشرتی نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں تطہیر فکر و نظر نہ ہو جائے' انسان ویسا ہی کرتا ہے جیسا سوچتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی سوچ کی بنیادیں صحیح نہ ہوں اس کا کردار صحیح قالب میں نہیں ڈھل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے بے نقاب ہو گئی کہ فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی راہ بڑی صبر آزما اور ہمت شکن ہے۔ اس لئے کہ اس راہ میں بڑی آہستہ خرامی اور نرم روی کی ضرورت ہے۔ اس میں سطح کی تلاطم انگیزیاں نہیں بلکہ عمیق دریا کی غیر محسوس روانیاں ہیں۔ پھر اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ جذبات پرست قوم پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپکنے کی خوگر ہوتی ہے اور قلب و نظر کی تبدیلی کے آثار کئی نسلوں کے بعد جا کر سامنے آیا کرتے ہیں۔ یعنی' غالب کے الفاظ میں' عجلت پسند قوم کی تمنائے حصولِ مقاصد بے تاب' اور دل کی دنیا کا عشق آسا انقلاب' صبر طلب ہوتا ہے۔ اس لئے ہنگاموں کی عادی قوم فکر و نظر کی تبدیلی کی جدوجہد کو ''عمل'' میں شمار ہی نہیں کرتی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے متعلق' شورش انگیز' ہنگامہ پرور ''راہنمایانِ ملت'' یہ الزام عائد کیا کرتے تھے کہ

''اقبالؔ ایک بے عمل شاعر ہے''۔ ان کے نزدیک عمل سے مفہوم انہی جیسی ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ یہی لوگ قائداعظم علیہ الرحمۃ کے متعلق بھی یہی طعن دیا کرتے تھے کہ وہ عملی انسان نہیں۔ اور عمل سے ان کی مراد ہوتی تھی جیل خانہ کی یاترا کرنا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ ''سراپا عمل''، فصلی طیور، اپنی اپنی بولیاں سنا کر اڑ گئے اور باقی رہنے والے نتائج، انہی ''بے عمل'' انسانوں کے فکر و مساعی سے پیدا ہوئے۔

طلوع اسلام نے اپنے لئے قلب و نگاہ کی تبدیلی کی اسی دشوار گذار راہ کو تجویز و اختیار کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ راہ کتنی لمبی اور اس کا سفر کس قدر حوصلہ آزما ہے۔ پیش پا افتادہ مفاد کی ایمان شکن جاذبیتیں بھی اس کے سامنے ہیں اور قدم قدم پر اسے دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ وہ ان مفادات کے سہل الحصول طریقوں کو بھی جانتا ہے اور ان کے غصب و نہب کی راہوں سے بھی واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے لئے وہی طریق تجویز کیا ہے جس میں نہ کوئی عاجلانہ لذت ہے نہ نگاہ فریب کشش۔ نہ فوراً مشتعل ہو جانے والے جذبات کی جھوٹی تسکین کا سامان ہے نہ راتوں رات انقلاب برپا کر دینے والی طفلانہ آرزؤں کی فریب دہی کا کوئی نسخہ۔ اس کی راہ، ستاروں کی سی خاموش روانیوں کی کہکشاں ہے جو رات کی پرسکوت و مہیب تنہائیوں میں بے بانگ رحیل و بے جرسِ کارواں، چپکے ہی چپکے طول و طویل منازل طے کرتی جاتی ہے، ھی حتیٰ مطلع الفجر۔ وہ اپنے قارئین کی اس بے تابیٔ تمنا سے بھی خوب واقف ہے جو ایک طرف اس پر یقین رکھتے ہیں کہ طلوع اسلام کی دعوت، حق و صداقت کی دعوت ہے اور دوسری طرف یہ دیکھتے ہیں کہ مسانید اثر و اقتدار پر وہ گروہ اور جماعتیں متمکن ہوئی جاتی ہیں جن کے پاس جذبات انگیزی کے سوا اور کچھ نہیں تو اس سے ان کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے جو بعض اوقات ان خطوط کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے اقتباس سے لمعات پیش نظر کی ابتدا ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ طلوع اسلام کوئی متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو ان کی اس سے مراد کیا ہوتی ہے! طلوع اسلام نے آج تک کوئی تنقید ایسی نہیں کی کہ جس کی تصحیح کا پہلو بھی وہ سامنے نہ لے آیا ہو۔ اس نے کبھی کوئی منفیانہ گوشہ ایسا نہیں پیش کیا جس کا مثبت گوشہ بھی ساتھ ہی اجاگر نہ کر دیا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ خلاء، فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے جب وہ کسی غلط چیز کو ہٹانے کی دعوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کی جگہ کونسی صحیح چیز رکھنی چاہئے۔ لہٰذا طلوع اسلام جب کبھی لا الہ کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی الا اللہ بھی پکارتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ

لا والا ساز و برگِ اُمتاں
نفیٔ بے اثبات مرگِ اُمتاں

اس لئے وہ تخریب بلا تعمیر کا نقشہ کس طرح سامنے رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کے جو بہی خواہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ تنقید کے ساتھ متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو متبادل اسکیم سے ان کی مراد ایسی اسکیم ہوتی ہے جو زمامِ اقتدار و اختیار کو غلط ہاتھوں سے فوراً چھین لے۔ اگر متبادل اسکیم سے ان کی یہی مراد ہے تو وہ معاف رکھیں! طلوع اسلام ایسی متبادل اسکیم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کو تو

وہ پیش پا افتادہ مفاد کی چھین جھپٹ قرار دیتا ہے جس نے قوم کو اس درجہ سطحی جذبات کا پیکر اور ہماری تمام تحریکات کو بے نتیجہ بنا رکھا ہے۔ طلوع اسلام ایسی ''متبادل اسکیم'' دیتا ہے جس سے قوم کی نگاہوں میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے کہ وہ زمامِ اقتدار و اختیار کسی غلط ہاتھ میں جانے ہی نہ دے۔ طلوع اسلام سے ایسی محکم اسکیم کی تمنا رکھئے' ویسی عاجلانہ اسکیم کی نہیں۔

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی ست
زما نگاہ طلب' کیمیا چہ می جوئی؟

اور یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی حالانکہ اس کے لئے احباب کی ''بیتابیٔ تمنا'' بار بار اصرار کر رہی ہے لیکن وہ اس طریقِ جماعت سازی کے بھی خلاف ہے اور اسے محض عاجلانہ مفاد پرستی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یہ جماعتیں کس طرح بنتی ہیں؟ کچھ لوگ اکٹھے ہو کر ایک پارٹی کا اعلان کرتے ہیں اور اس کے اغراض و مقاصد کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ دوسروں کے ہاں سے فریب خوردہ افراد' اس نئی آواز میں پناہ ڈھونڈتے اور جماعت اول سے اپنی فریب خوردگی کے انتقام کا سامان مضمر سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے ہیں۔ یوں یہ جماعت وجود میں آ جاتی ہے۔ اس کے بعد جماعتی عصبیت سے ان افراد میں سیمنٹ کا کام لیا جاتا ہے' یعنی ان کے دل میں اپنی جماعت کے برسرِ حق ہونے اور دوسری جماعتوں کے باطل پر اکٹھا ہونے کا ایمان کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ جماعتی عصبیت جسے قرآن کل حزب بما لدیھم فرحون کی عمیق نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ہر جماعت اس عقیدہ میں مگن ہوتی ہے کہ وہی برسرِ حق ہے۔ اس طرح باہمی نفرت سے قوم ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ یہی وہ فرقہ پرستی اور جماعت سازی ہے جسے قرآن کھلے لفظوں میں شرک *(*ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون۔ (۳۰/۳۳)۔ مسلمانو! دیکھنا کہیں (اسلام لانے کے بعد پھر سے) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں پارٹیاں (فرقے) بنالیں اور پھر خود بھی ایک پارٹی بن گئے اور ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر پارٹی مگن ہو کر بیٹھ گئی کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔) قرار دیتا ہے اور خدا کا عذاب کہہ کر پکارتا ہے*۔ (*قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم بأس بعض (۶/۶۵)۔ کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا تمہیں پارٹیوں میں بانٹ دے اور اس طرح تم ایک دوسرے سے لڑائی کا مزہ چکھو۔) پہلے زمانہ میں یہی گروہ بندی مذہبی فرقوں کے نام سے متعارف ہوتی تھی۔ اس دورِ سیاست میں یہ فرقہ بندی سیاسی جماعتوں کے پیرہن میں پائے کوب ہوتی ہے۔ روح وہی پرانی ہے' فقط نقاب نئے ہیں۔

کہا جائے گا کہ خود خدا بھی مسلمانوں کو حزب اللہ (خدا کی جماعت) قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہر جماعت شرک کا مظہر اور عذابِ خداوندی کا پیکر نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ خدا ملتِ اسلامیہ کو' غیر مسلموں کے مقابلہ میں حزب اللہ کہتا ہے اور دوسروں کو حزب الشیطان۔ یعنی حزب اللہ' پوری کی پوری ملت ہے نہ کہ ملت کے اندر ایک گروہ۔

پھر یہ کہا جائے گا کہ آج جس حالت میں مسلمان ہے جب انہیں اس حالت سے نکال کر صحیح اسلامی حالت تک لے جایا

جائے گا تو اس کے لئے بہر حال کسی نہ کسی جماعت کی ضرورت ہوگی۔ جماعتی رنگ کے بغیر آپ کام کیسے کریں گے؟ سو پہلے تو یہ دیکھ لیجئے کہ قرآن نے جب فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرک اور عذابِ خداوندی قرار دیا ہے تو اس میں ایسے حالات میں بھی کسی استثنیٰ کا ذکر نہیں۔ اس کے بعد پھر وہی چیز سامنے آئے گی کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام کیسے کیا جائے؟ تو سوال یہ ہے کہ کیا جماعت سازی کے بغیر اصلاح کے کام کی کوئی شکل نہیں نکل سکتی؟ کیا طلوع اسلام نے اپنی ہندوستان کی چار سالہ زندگی اور پھر اس کے بعد پاکستان کی سہ اَۃِ ثانیہ میں جماعت سازی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا؟ ضرورت ہے صرف کام کرنے والوں کی۔ یہ رفقائے کار اپنے اندر' تقسیم عمل کے طریق پر' نظم وضبط پیدا کریں گے اور ایک طے کردہ پروگرام کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیں گے۔ ان کی دعوت یہ نہیں ہوگی کہ ہماری ''جماعت'' میں شامل ہو جاؤ۔ یہ اپنے آپ کو کسی پارٹی کے ساتھ منسوب کئے بغیر' مسلمانوں کے فکر ونظر میں تبدیلی کی کوشش کریں گے۔ یہ انہیں مذہب کے غلط تصور کی بجائے' دین کا صحیح تصور دیں گے۔ ان کی حیثیت معلمین کی ہوگی نہ کہ کسی پارٹی کے داعیان کی۔ اس وقت بھی حلقہ طلوع اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طلوع اسلام کی پیش کردہ تعلیم کو اپنے اپنے دائرہ عمل واثر میں نہایت خاموشی سے پھیلاتے رہتے ہیں اور' دوسرے تو ایک طرف' خود ادارۂ طلوع اسلام کو بھی ان کی اس تبلیغ و تنشیر کا علم نہیں ہوتا' وہ کسی جماعت کے رکن نہیں' کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود' وہ اپنے دائرہ میں رجعت الی القرآن کی اس دعوت کو عام کرتے رہتے ہیں جس کا نقیب طلوع اسلام ہے۔ طلوع اسلام کو اپنے ان خاموش' گمنام اور غیر متعارف' مبلغین پر ناز ہے کہ اس کا مقصود اس قسم کے لوگ پیدا کرنا ہے جو ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہٹ کر چپکے ہی چپکے دوسروں کے قلب ونگاہ میں وہی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ان کی نگاہ میں پیدا ہو چکی ہے۔ انہی غیر متعارف مبلغین میں سے اکثر ادارۂ طلوع اسلام کے ساتھ اپنا ربط قائم رکھتے ہیں۔ وہ ادارہ سے ان مشکلات کا حل دریافت کرتے ہیں جو انہیں اپنی اس تبلیغ کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ وہ ان استفسارات کا جواب پوچھتے ہیں جو ان سے دوران تبلیغ میں کئے جاتے ہیں اور جن کے جواب میں انہیں دقت پیش آتی ہے۔ وہ اپنے مشوروں سے ادارہ کو مستفید کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح قرآن کے طالب علموں کا یہ ایک خاموش سا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حلقہ کا کوئی نام نہیں' یہ کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ ان کے سامنے کوئی پیش پا افتادہ مفاد نہیں۔ یہ اپنی کوششوں کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ جس ذہنی اور قلبی انقلاب کے لئے کوشاں ہیں اس کے سوا ملت کے مرضِ کہن کا کچھ اور چارہ نہیں۔ اس وقت اس انقلاب کے کوئی محسوس اور نمایاں آثار ان کے سامنے نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پوری عمر اس جدوجہد میں صرف کر دیں اور یہ انقلاب محسوس صورت میں ان کے سامنے نتیجہ خیز نہ ہو۔ لیکن وہ اس کے باوجود نہایت استقلال واستقامت سے اپنی کوششوں میں منہمک ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی بنیادی تبدیلیاں ایک دن میں رونما نہیں ہو جایا کرتیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کے متعلق اور تو اور خود ذات رسالتمآب ﷺ سے کہہ دیا گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے محسوس نتائج حضور ﷺ کے بعد ظہور پذیر ہوں۔ اس لئے کہ اس جدوجہد میں کسی ایک فرد' یا افراد کی اپنی زندگی کا

سوال ہی نہیں۔ سوال تو پوری کی پوری قوم میں انقلاب پیدا کرنے کا ہے اور اس کے بعد' تمام نوعِ انسانی میں انقلاب پیدا کرنے کا۔ یہ ایک نسل کی جدوجہد میں پیدا ہو جائے یا اس کے لئے دس نسلوں کی مسلسل جدوجہد کی ضرورت پیش آئے۔ مدت کا اس میں کوئی سوال نہیں۔ اگر اسی قسم کے انقلاب کی کوشش سو سال پہلے شروع ہوتی تو آج جو کچھ ہم دیکھنا چاہتے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ اگر یہ کوشش اس سے پہلے شروع نہیں ہوئی تو اسے آج شروع کر دینا چاہئے تاکہ آج نہیں' تو کل' کسی نہ کسی وقت یہ انقلاب ظہور پذیر ہو جائے۔ لیکن اگر آپ مدت کی طوالت سے گھبرا کر' پھر عاجلانہ طریقِ کار کی طرف لپک پڑے تو یہ انقلاب پھر ویسے کا ویسا رہ جائے گا۔ یہ عاجلانہ طریق کار' سردرد کے لئے اسپرین کی ٹکیہ ہے۔ سردرد ایک منٹ میں غائب ہو جائے گا لیکن جب اسپرین کا اثر زائل ہو گا تو پھر پہلے سے بھی دگنی شدت کے ساتھ ابھرے گا اور اگر آپ اسے ہر بار اسی طرح اسپرین کے عاجلانہ علاج سے دباتے رہے تو ممکن ہے ایک دن آپ کو درد کی جگہ سر سے ہی جواب مل جائے۔ مسلمان جذبات پرستی کی اسپرین سے علاج کا خوگر ہو رہا ہے' یہ عاجلانہ فائدہ چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں سردرد غائب ہو جائے۔ لیکن ایک طبیب حاذق کی نگاہ عاجلانہ فائدہ پر نہیں بلکہ مزمن مرض کی علت کی اصلاح پر ہوتی ہے اور وہ اصلاح وقت بھی چاہتی ہے اور علاج میں استقامت بھی۔ اس میں ایک سردرد کے علاوہ اور دردسری بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ لیکن جب آرام آئے گا تو ہمیشہ کے لئے مرض جاتا رہے گا۔ طلوع اسلام' اسپرین کی ٹکیہ نہیں دیتا۔ یہ اسی حاذقانہ انداز سے علاج کرنا چاہتا ہے جس طریق سے اس سے پہلے ایک مرتبہ علاج ہو چکا ہے اور اس علاج کے نتائج دنیا دیکھ چکی ہے۔

وہی دیرینہ بیماری' وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

یہ ہے طلوع اسلام کا مقصود و منتہیٰ اور یہ ہے اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا طریق کار۔ جو اس طریق کار کی افادیت اور خیریت انجام پر یقین رکھتا ہے وہ اس کا ساتھ دے۔ لیکن جو اسی جدوجہد کا کامیاب تصور کرے جس میں عاجلانہ مفاد کو سمیٹا جا سکے' اسے کوئی اور ساتھی تلاش کرنا چاہئے کہ اس کے لئے اس طریق کار میں محنت و مشقت کے سوا کچھ نہیں۔ من یقول ربنا اتنا فی الدنیا و مالہ فی الاخرۃ من خلاق (۲۰۱/۲) ''جو شخص محض پیش پا افتادہ قریبی مفاد چاہتا ہے (اسے وہ مفاد تو مل جاتے ہیں۔ نؤتہ منھا۔ ۱۴۴/۳) لیکن اس کا مستقبل کے مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔'' اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ ان دونوں راہوں میں سے جونسی راہ پسند کریں اپنے لئے تجویز کر لیں۔ طلوع اسلام اپنے لئے ایک راہ تجویز کر چکا ہے اور اسے اس راہ کے صراط مستقیم ہونے پر یقین ہے۔

کہہ دیا جائے گا کہ آپ قلب و نگاہ کی تبدیلی کی فکر کرتے رہئے اور اتنے میں بے زمام قوتیں ایسا استحکام حاصل کر جائیں گی کہ پھر ان کے پاؤں اکھیڑنا ممکن نہیں رہے گا۔ لیکن یہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ نہ ہم جناب صاحب ضرب کلیمؑ اور حضور نبی

اکرم ﷺ سے بڑھ کر داعیٔ انقلاب ہیں اور نہ ہی یہ سرکش قوتیں، فرعون اور ابوجہل سے زیادہ محکم گیر ہیں۔ حضرت موسیٰؑ چالیس برس تک قوم کے قلب و نگاہ کی صحیح تربیت میں مصروف تگ و تاز رہے اور بنی اسرائیل ارض موعود پر ان کی وفات کے بعد قدم رکھ سکے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کامل تیرہ برس تک نہایت سکون و استقامت سے اپنے پیغام کی خاموش تبلیغ میں منہمک رہے اور اس دوران میں سرکش قویٰ کی طرف سے آپ صعوبات کو بڑی ہمت اور استقلال سے برداشت کرتے رہے۔ جب انہیں بھی بیج سے کھیتی پکنے تک کا عرصہ انتظار میں گذارنا پڑا تو ہم کس طرح دانہ بوتے ہی فصل کاٹ سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات اس بیتابیٔ تمنا یا مفاد عاجلہ کے مظاہر ہیں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ پھر اسے بھی سمجھ رکھئے کہ جمہور کی نگاہ کی تبدیلی سے اتنا بڑا اتند و تیز سیلاب اٹھا کرتا ہے کہ بڑی سے بڑی زمین گیر قوتیں اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جایا کرتی ہیں۔ سرکش قوتوں کی یہ محکمیت اسی وقت تک عمیق و شدید دکھائی دیتی ہے جب تک ہم میں ناپختگی ہے۔ داعیانِ انقلاب کے قلب و نگاہ کی پختگی اور محکمی کے آگے یہ قوتیں پرکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ لہٰذا صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ نہایت استقامت اور سکون سے قلب و نگاہ کی تبدیلی کے لئے سعیٔ پیہم میں مصروف رہئے اور جب یہ تبدیلی پختگی تک پہنچ جائے تو باطل کی قوتوں کو ایک ہی جھٹکے سے الگ کر دیجئے۔

بانشۂ درویشی، در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

یہ ہے طلوع اسلام کا مقصد و طریق کار۔ اگر آپ میں اس سے زیادہ کام کرنے کی ہمت ہے تو ایک قدم اور آگے بڑھئے اور وہ قدم یہ ہے کہ تمام کام چھوڑ کر ملک کے طول و عرض میں درسگاہوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم کیجئے جن میں ابتدا سے انتہا تک اس نہج کی تعلیم دی جائے جس کی تبلیغ طلوع اسلام کے صفحات پر ہوتی ہے، یعنی خالص قرآن کی روشنی میں تمام علومِ جدیدہ کی تعلیم۔ اگر آپ نے یہ کر دیا تو تبدیلیٔ قلب و نگاہ کا وہ عرصہ جس کی درازی آپ کو شبِ ہجر کی طرح ڈرا رہی ہے، سمٹ کر بیس پچیس سال میں ختم ہو جائے گا۔ جونہی آپ کے بچوں کا پہلا گروہ ان درسگاہوں سے فارغ ہو کر نکلا، ساری زمین پر چلتا پھرتا انقلاب نظر آ جائے گا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ اس خطۂ ارض کی تقدیر کس طرح سے بدل جاتی ہے۔ اگر قوم میں سرسید مرحوم کی سی ہمت والے لوگ موجود ہیں تو وہ کسی ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سارے ملک میں اس قسم کی آزاد درسگاہوں کا جال بچھا دیں۔ اگر آپ نے ہمت کر کے اس خطۂ زمین کو بیس پچیس سال تک اغیار کی نظرِ بد سے بچا لیا اور ادھر درسگاہوں سے وہ شاہیں بچے نئے بال و پر لے کر نکل آئے تو پھر آپ آسمان سے سینہ تان کر کہہ سکیں گے کہ

دیدہ آغازم! انجامم نگر!!

اور اگر آپ یہ نہیں کرنا چاہتے تو پھر ان مقدس مداریوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہئے جو اپنے جھولے میں سب کچھ رکھنے کے دعویدار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کے ایم اعظم

پاکستان کے لئے دنیوی فلاح اور نجات اخروی کا راستہ

پاکستان کے موجودہ دگرگوں حالات میں تشویش ناک بات یہ نہیں کہ ہمیں سیاسی اور معاشی استحکام نصیب نہیں اور ہم امریکہ کی سفاکانہ یلغار کا مرکزی ہدف ہیں۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ کسی طرف سے بھی روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ نہ ہی ریاست اور سیاست کے ایوانوں سے، نہ ہی عسکری قیادت سے، نہ مساجد کے منبروں سے اور نہ ہی عوامی سطح سے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا ہے۔ کہیں سے بھی شرار آرزو پھوٹتا نظر نہیں آتا۔

جمال الدین افغانی کے خیال میں عالم اسلام کے زوال کی بنیادی وجہ فکر اسلامی میں انحطاط ہے۔ اگر کسی دین کے فکر میں انحطاط رو پذیر ہو جائے، تو اس کی تبلیغ و ترویج بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ فکری انحطاط، اسلامی تہذیب کے لئے جس کا دارومدار دین پر تھا، نہایت ہی مہلک ثابت ہوا۔ ملت اسلامیہ کو فکری زوال سے نکالنے کے لئے علامہ اقبال نے ایک منفرد کوشش کی تھی، جو آج پچھتر سال گذرنے کے بعد بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ فکر اقبال 'لادینی' اور 'دینی' مادہ پرستی کی بتدریج ابھرتی ہوئی لہروں کے تلے دبا ہوا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ فکر اقبال کو بظاہر ابھارنے والی کوششیں بھی فکر اقبال کو دبا رہی ہیں۔

بہرحال دو راستے ہیں، جن پر گامزن ہو کر مسلمان اپنی عظمت گم گشتہ کو بازیاب کر سکتے ہیں۔ ایک راستہ توحید کی وصولیابی کا ہے، جبکہ دوسرا راستہ اسلامی نظام معیشت کے قیام کا ہے۔ دراصل یہ راستہ بھی نظریۂ توحید سے ہی نکلتا ہے یعنی یا تو ہم توحید کو حقیقی معنوں میں اپنا کر اسلامی اخوت و مساوات کے اہداف کی طرف سفر کر سکتے ہیں یا پھر اسلامی معاشرت و معیشت کی طرف جادہ پیما ہو کر توحید کی وصولیابی یا عمل پذیری کر سکتے ہیں۔

ہم سے اکثریت کے لئے توحید مافیہ سے معریٰ ایک لفظ ہے، جس کا قولی اقرار ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کی امکانی قوت پر گرفت تو صحیح فہم قرآن سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ نظریہ توحید ایک ایسا انقلابی نظریہ ہے، جو دنیا کے مروجہ اجتماعی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظاموں پر تیشہ بن کر گرتا ہے۔ عموماً لوگ مذہبی معنوں میں تو اللہ کو معبود مانتے ہیں لیکن اسکی قانونی اور سیاسی حاکمیت کے مضمرات کا پورا شعور نہیں رکھتے:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اللہ تعالیٰ کی وحدت' وحدت انسانی کے ساتھ منسلک ہے۔ توحیدی معاشرہ کی بنیاد انسانی اخوت اور مساوات پر ہے۔ توحیدی معاشرہ میں کسی قسم کے طبقات نہیں ہوتے اور نہ ہی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نظام سیاسی' معاشی' تعلیمی اور معاشرتی۔ طبقاتی خطوط پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ یہ توحید پر پوری طرح قائم نہ ہونے کی ہی وجہ ہے کہ ہم ذہنی وروحانی طور پر مضمحل ہو کر مختلف انواع کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اصول پرستی کی بجائے تاریخ پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ عموماً اصول کی دشمن ہوتی ہے۔ جب تاریخ کو دین کا حصہ بنا دیا جاتا ہے' تو دین کی اصولی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ تاریخی شخصیتیں اتنی اہم ہو جاتی ہیں کہ اصولوں کو ان پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ اس تاریخی جبر کی وجہ سے مسلک دین پر حاوی ہو جاتے ہیں اور اللہ کی خوشنودی سراب بن کے رہ جاتی ہے۔ دین کے اصول ابدی اور اٹل ہوتے ہیں جبکہ اصولوں کی تعمیل و تکمیل کے لئے بنائے جانے والے ادارے یا تنظیمیں وقتی حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو وہ اپنے گذرے وقتوں کے اداروں کو مقدس ومتبرک بنا کر رجعت اور جمود کا شکار ہو جاتی ہیں۔

دورِ حاضر کے مسلمان علمی وفکری نشاۃ ثانیہ' روحانی تجدید اور مادی ترقی سے تب ہی ہمکنار ہو سکتے ہیں' جب وہ توحید کی آفاقیت اور اسلامی مساوات کو مکمل طور پر اپنا لیں۔ توحید پر پوری طرح قائم نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا اللہ کے ساتھ رشتہ جزوی' انسان کے ساتھ رشتہ مطلبی اور ماحول کے ساتھ رشتہ استحصالی ہو کے رہ گیا ہے۔ جب تک ہمارے دینی فکر وعمل کی بنیادیں صحیح فہم قرآن پر استوار نہیں ہوں گی ہم دور حاضر کے مادہ پرستانہ فکر کی بھول بھلیوں میں گم رہیں گے۔

ایک غور طلب بات یہ ہے کہ ہمارے قومی انحطاط کی وجہ دین سے دوری ہے یا اپنے اپنے مسلک سے شدید لگاؤ۔ دین مصطفی ﷺ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے قلزم سے گریز کی راہ اپنا کے' ہمارے دور حاضر کے مسلمان فہم قرآن کی ناقص تعبیریں لئے اپنے اپنے مسلکوں کی تنگ آبناؤں میں بے اثر زندگیاں گذار رہے ہیں۔ مزید براں ہمارے دیندار طبقات کا ایک بیشتر حصہ ظاہراً اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مگر حقیقتاً بے مقصد نصب العین اور ایک نامکمل اور ادھوری جستجو کے تعاقب میں' غیر کامل شے کو کامل تصور کرتے ہوئے' اپنی قیمتی زندگیوں اور خداداد صلاحیتوں کو ضائع کرتا رہتا ہے۔ اسلامی تحریکوں اور تبلیغی اجتماعات میں جمع ہونے والے مسلمانوں کا جم غفیر اگر اپنی صلاحیتیں اور وقت کسی مثبت اصلاحی یا فلاحی پروگرام اور حقیقی دین پر صرف کرے تو شاید یہ وطن عزیز بہت جلد انقلاب سے ہمکنار ہو جائے۔

دراصل بات بنیاد اور اساس کی ہوتی ہے۔ جب بنیاد ہی غلط ہو' تو اس پر اٹھائی گئی عمارت کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ غلط بنیاد پر کی گئی محنت' غلط نتائج ہی پر منتج ہوگی اور ہماری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔

پاکستانی قوم کا المیہ یہ ہے کہ فروعی مسائل میں الجھی رہتی ہے۔ یہ ظاہری عبادات کو ہی مکمل دین تصور کئے ہوئے

ہے' حالانکہ ظاہری عبادات ہمارے دین کے برگ و بار ہیں' بنائے اسلام نہیں۔ اسلام کے پانچ ارکان امت کے مناسک ایمان کے ظواہر ہیں' اصل دین توحید اور اس کے مضمرات اخوت انسانی' احترام آدمیت اور معاشی مساوات ہیں۔ دور حاضر کے مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ ان کے دین کا دارومدار عبادات کی ادائیگی پر مرکوز ہوگیا ہے اور معاملات پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں' جبکہ اسلام کی اساس معاملات پر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مکمل اطاعت کو بھی منظور نہیں فرماتا جب تک اس کے ساتھ نیک اور صالح اعمال نہ ہوں (البقرہ:112)۔ عبادات کا کام تزکیہ نفس کے ذریعے کردارسازی اور لوگوں کو جہادزندگانی کے لئے تیار کرنا ہے' جس میں ہمارا تعلیمی اور دینی نظام کامیاب نہیں ہو پا رہا۔ دینی عبادات کے تعامل (Process) سے ایسے مسلمان برآمد نہیں ہو رہے' جن کی آرزو ہم سب اپنے دلوں میں لئے ہوئے ہیں۔

دینی عبادات کو بس جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے' جبکہ عبادات کا مطلب محض قولی اور نمائشی اقرار نہیں بلکہ احکام الٰہی پر صدق دل سے عمل پیرا ہونا ہے۔ دورحاضر کے اکثر مسلمانوں کا فہم دین ناقص ہے' اس لئے وہ توحید کے بلند بانگ قولی اقرار کے باوجود بہت بڑے بت پرست ہیں:

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل!
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

ہمارے بے شمار مخلص اور نیک دل مسلمان اپنے اپنے ناقص فہم دین کی ترویج اور توسیع پر کثیر مال و زر خرچ کر رہے ہیں اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کی خوشنودی کی بجائے' اس کی ناراضگی مول لے رہے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر لوگ دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہیں مگر اپنے اعمال سے غافل ہیں حالانکہ یہ کتاب اللہ کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔ کیا یہ عقل سے کام نہیں لیتے (البقرہ:44)۔ بے شک جن کے دلوں میں کجی ہے' ان کو گمراہ کرنے کے لئے اللہ کی یہ کتاب ہی کافی ہے (البقرہ:26' ال عمران:7)۔ دوسری طرف ہمارے نظریاتی دینداری کے پرجوش علمبرداروں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ دین مصطفی کا دارومدار' تعلق باللہ' تزکیہ نفس' حکمت' رواداری اور اخلاص پہ ہے' اپنی دینی جدوجہد کی اساس نظریہ' تنظیم' تصادم اور انقلاب پر رکھی ہے۔

عبادات مشیتِ الٰہی پیدا کرنے کی بجائے لوگوں کے دل سخت کر رہی ہیں اور انہوں نے خود تحسینی اور خودفریبی کے التباس میں اپنے آپ کو صالحیت کے مقام پر فائز کر کے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خوف خدا نہیں ہے۔ حالانکہ خوف خدا ہی سب سے بڑی حکمت ہے (السیوطی' درمنثور)۔ یہ لوگ دنیاوی زندگی کے ظاہری پہلو کو ہی جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل غافل ہیں (الروم:8-7)۔ مادہ پرستانہ فکر کا غلبہ اس قدر ہے کہ کوئی بھی اس کے دائرہ کے باہر سوچنے کے لئے تیار نہیں۔ علماء بھی اپنے اپنے نظریاتی اور عقلی فریم ورک سے چمٹے ہوئے ہیں۔ عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی تحریک اٹھے گی بھی تو کہاں سے' جبکہ ملاؤں کے منبروں اور پیروں کی مجالس میں بھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا تسلط ہے۔ ہمارے علماء اور دینی

اکابرین خدا پرستی کے پردے میں خود پرستی میں مبتلا ہیں۔ دین فروش ملا' اسلام کے سوداگر اور قرآن کے تاجر دین کا رشتہ قوت اور سرمایہ سے جوڑ کر لوگوں کو جادہ حق سے دور کر رہے ہیں۔

ہماری ظاہری عبادات پر بڑھتی ہوئی توجہ ایک دینی دکھاوے کے بلبلہ (Bubble) کا باعث بن رہی ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی عبادات لوگوں کو اسلام کے عینی اہداف کے قریب لے جانے کی بجائے روز بروز دور کر رہی ہیں۔ چنانچہ وہ دن دور نظر نہیں آ رہا جبکہ حقیقت اور اس کی ناقص تعبیر کے درمیان خلیج نا قابل برداشت حد تک وسیع ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ کے قانون فطرت کے تحت یہ بلبلہ دھماکہ سے پھٹ جائے گا اور ہماری حالت یہ ہو کے رہ جائے گی کہ نہ پائے ماندن' نہ جائے رفتن۔ ان حالات کے پیش نظر لازم یہ ہے کہ ہم اپنے رویوں کا صدق دل سے محاسبہ کریں اور اللہ کی رَسی کو مضبوطی سے پکڑ کر صراط مستقیم کی طرف رجوع کریں۔

پاکستانی معاشرہ میں منافقت کا غلبہ ہے' جبکہ تاریخ عالم ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تاریخ سازی میں صرف صاحب کردار لوگوں نے ہی رول ادا کیا ہے۔ منافقوں کا اس میں کوئی رول نہیں ہے۔ اگر ہم پاکستان کو اس کے انحطاط سے نکالنا چاہتے ہیں' تو ہمیں چاہئے کہ ایک مثبت پروگرام (تعلیم و تربیت اور میڈیا) کے تحت پاکستانیوں کو منافقت کی دلدل سے نکالیں۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہئے کہ منافقت سے نجات حاصل کئے بغیر ہماری کوئی بھی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار نہ ہوگی۔

فی الحقیقت بات باطنی قوت کی ہے۔ ہم اندر سے کمزور ہیں کیونکہ اسلام نے ہمارے اندر سرایت نہیں کیا۔ ظاہری بود و باش ایک فروعی مسئلہ ہے۔ اصل مسئلہ ایمان کی مضبوطی' تعلق باللہ اور وہن سے نجات کا ہے۔ مسلمان کے لئے اس کی ظاہری اور باطنی قوت کا راز تعلق باللہ میں ہے۔ جب ہمارا اللہ سے تعلق صحیح بنیادوں پر قائم ہوگا تو ہمارا ہر کام ٹھیک ہو جائے گا۔ ان دگرگوں اور بگڑتے ہوئے حالات میں جبکہ ہر طرف سے دشمن ہماری جان کے درپے ہیں' تو ہمارے لئے رجوع الی اللہ کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے؟ مگر یہ رجوع ادھورا اور کمزور نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کی اساس ایک پائیدار تعلق باللہ اور اخلاص پر ہونی چاہئے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی سچی خوشنودی حاصل کر کے فتح یاب ہوں۔

مغرب نے تو مذہب کو زندگی اور اس کے معاملات سے الگ کر دیا۔ اسے عقیدہ کے طور پر تو زندہ رکھا مگر دنیوی معاملات کو عقل کے سپرد کر دیا۔ اس طرح مغرب نے پادریوں کے مسخ شدہ مذہب سے نجات حاصل کر لی۔ ہمارے ہاں افسوسناک صورت حال یہ بنی کہ مالدار طبقہ اور ملاؤں کی ملی بھگت نے ہمارے حقیقی انقلابی دین کو پس پشت ڈال کر' مذہب کو دنیوی معاملات سے علیحدہ کر کے صرف عبادات و ریاضت تک محدود کر دیا حالانکہ انبیاء علیہم السلام نے دنیوی معاملات کو اخلاقی اقدار پر قائم کرنے کے لئے جانفشاں جدوجہد کی تھی۔ ایران کے عالی قدر مفکر' ڈاکٹر علی شریعتی کے بقول مقدس بانیان مذاہب کے حقیقی مذہب کو مذہبی پیشوائیت

نے مذہب پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے اور اپنی مالی حالت کو خوش حال بنانے کے لئے مراعات یافتہ طبقہ کے مفاد میں اس طرح تبدیل کر دیا ہے کہ وہی تبدیل شدہ مذاہب اب حقیقی مذہب کے طور پر عوام کے دل و دماغ پر مسلط ہو چکا ہے۔

قرآن نے نہ صرف انبیاء پر تشدد کا ذکر کیا بلکہ اقوام کی تباہی کا باعث بھی مالدار طبقہ کی دولت کے بل بوتہ پر محنت کے استحصال اور عیش پرستی کو قرار دیا۔ اس کے برعکس مذہبی پیشواؤں نے اپنی جلب منفعت کے لئے اس خیال کو آگے بڑھایا کہ امیر اور غریب خدا بناتا ہے۔ یہ انسان کی غلط تقسیم دولت کے باعث پیدا نہیں ہوتے۔ اس طرح حقیقی مذہب کی تعلیمات کو مسخ کر دیا گیا اور ہر مذہب میں یہ بات رائج ہوگئی کہ امیر اور غریب خدا بناتا ہے اور لوگوں کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ وہ خیرات کے ذریعہ مفلوک الحال افراد کی مالی مدد کریں۔ جس کے معنی یہ ٹھہرے کہ ہمیشہ کے لئے معاشرہ میں امیر لوگ بھی رہیں اور غرباء کا وجود بھی باقی رہے تاکہ امراء غرباء کی مالی مدد کرتے رہیں' یعنی:

تیرے امیر مال مست' تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی' خواجہ بلند بام ابھی!

اسلامی نظریات کے مطابق قدرتی وسائل کی کمی کی وجہ سے غربت اور افلاس پیدا نہیں ہوتے بلکہ اس کا سبب اسراف و تبذیر اور ضیاع ہے۔ مزید براں معاشرے کے حاجت مند افراد کا جو جائز حق ہے اس کی عدم ادائیگی بھی افلاس کا سبب بنتی ہے جیسا کہ سیدنا محمد ﷺ نے فرمایا ''کوئی آدمی صرف اس وقت بھوکا مرتا ہے جب امیر آدمی تعیش سے کام لیتا ہے۔'' اسلام کا پاکیزہ اور خالص نظریہ ایسے معاشرے کا وجود پسند نہیں کرتا جو دولت مندوں اور محروم لوگوں پر مشتمل ہو اور جہاں لوگوں کی کثیر و بیشتر تعداد بھکاریوں کے درجہ تک پہنچ گئی ہو اور وہ قلیل تعداد پر مشتمل امراء سے زکوٰۃ اور خیرات مانگنے پر مجبور ہو۔ ایسا معاشرہ اسلام کے اخوت اور مساوات کے اصولوں کے بالکل متضاد ہے اور اس میں معاشرے کی حقیقی ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔ یہ تصور مغربی سرمایہ داری اور جدید نو آبادیاتی نظام سے لیا گیا۔

اسلامی ریاست میں تمام خیراتی سرگرمیوں کا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ صرف عارضی مدت کے لئے ہیں اور صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ کے قیام اور حالات کے پیدا ہوتے ہی ختم ہو جائیں گی۔ اگر بعض غیر معمولی حالات کی وجہ سے پورا معاشرہ تنگی و عسرت کا شکار ہو جائے (جیسا کہ مثال کے طور پر اسلام کے ابتدائی ایام میں مسلم معاشرہ کے حالات تھے) تو ایسی عسرت اور تنگ دستی' روحانی طاقت کا ذریعہ بن جاتی ہے اور مستقبل کی عظمت کی بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی معاشرے کے موجود وسائل اس قدر بے ترتیب' بے ہنگم اور ناہموار طریقے سے منقسم ہوں اور اس کے نتیجہ میں بعض مخصوص گروہ با اثر ہوں اور زیادہ سے زیادہ وسائل پر قابض ہوں جبکہ عوام کی اکثریت اپنی تمام توانائیاں صرف ایک روٹی کے ٹکڑے کی تلاش میں صرف کر رہی ہو تو ایسے حالات میں غربت روحانی ترقی کی دشمن بن جاتی ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار تو تمام معاشرے کو خدا خوفی اور خدا ترسی سے دور کر دیتی ہے اور

روح کو تباہ کرنے والی مادیت کے شکنجے میں جکڑ دیتی ہے۔ پیغمبر اسلام رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ارشاد فرمایا کہ ''غربت بعض اوقات کفر میں بدل جاتی ہے۔'' تو یقیناً یہی حقیقت ان کے پیش نظر تھی۔

اسلام ایسا دین مبین ہے جو تمام دنیاوی اعمال کو اخلاقی اعمال قرار دیتا ہے اور انسانی زندگی کے کسی عمل کے کسی بھی پہلو کو اخلاق اور روحانیت سے مبرا قرار نہیں دیتا۔ اقتصادی عمل کے دو پہلو ہیں' ایک انفرادی اور دوسرا معاشرتی۔ حقیقی اقتصادی قدر یہ ہے کہ ایک فرد اپنے افعال و اعمال کے ذریعے نہ صرف اپنے آپ کو ترقی دے اور اپنی نشوونما کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ معاشرے کی خوش حالی میں فعال کردار ادا کرے۔ اسلام دولت کی پیداوار اور اس کی ملکیت کا مخالف نہیں لیکن وہ ذخیرہ اندوزی کے سخت خلاف ہے۔ اسلام کے نزدیک بہترین عمل یہ ہے کہ جائز اور قانونی ذرائع سے دولت کمائی جائے اور اسے فوری طور پر اپنی ضروریات کے علاوہ سرمایہ کاری اور اچھے اچھے معاشرتی کاموں پر بھی صرف کیا جائے۔ لیکن اگر ایک اقتصادی نظام' دولت اور قدرتی وسائل کی ملکیت کی بدولت سماجی و معاشرتی امتیاز اور فرق کے ذریعے ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر دائمی تسلط اور غلبہ فراہم کرنے کا باعث بنتا ہے تو ایسا اقتصادی نظام بنی نوع انسان کے لئے بہت بڑی لعنت ہے۔ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اکیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام صیہونیوں کی سرپرستی میں ایک خونخوار عفریت بن کے عالم اسلام اور تیسری دنیا کے غریب ممالک پر طبعی اور نظریاتی طور پر ظالمانہ تشدد کے ساتھ حملہ آور ہو رہا ہے۔ ہم ایک طاقتور اور منہ زور سرمایہ دارانہ نظام کا مقابلہ ایک کمزور اور دست نگر سرمایہ دارانہ نظام سے نہیں کر سکتے۔ توسیع پسند' استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کی بے پناہ یلغار کے سد باب کے طور پر جو بھی جدوجہد ہم کریں گے' مغرب بے دریغ ہم پر دہشت گردی کا الزام تھوپ دے گا۔

اسلام رنگ و نسل و زبان اور وطنیت کی نفی کر کے توحید کی بناء پر ایک روحانی الذہن قوم کی تشکیل کا خواہاں ہے۔ اسلام کا مقصد دنیا میں ظلم' خوف و حزن اور تصادم سے پاک معاشرہ کا قیام ہے' جس کے اہداف انسان کا زمین سے رشتہ معتدل کر کے اور اللہ سے رشتہ جوڑ کر' اس کے اندر دلسوزی' دردمندی' غمگساری اور انسان دوستی کے جذبات کو فروغ دینا اور توحید اور الخلق عیال اللہ کی اساس پر ایک انسان دوست معاشرہ کی تعمیر نو ہیں۔ ایک اللہ کی محبت ہمیں اس کی تمام مخلوق سے محبت کا درس دیتی ہے۔ اسلام کا مطمح نظر ایک توحیدی معاشرہ کا قیام ہے' جس میں معاشی طبقات کا وجود نہیں ہوتا۔ جب اللہ ہی قادر مطلق ہے تو کسی کو بھی کسی پر ظلم و ستم کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ایک توحیدی معاشرہ کا دارومدار عدل و احسان' احترام آدمیت' اخوت انسانی' اخلاق اور رواداری پر ہے۔ ایسے معاشرہ میں خوف و حزن کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا' نہ انفرادی سطح پر اور نہ ہی قومی یا بین الاقوامی سطح پر۔

جب اللہ نے ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری اپنے

ذمہ لے رکھی ہے تو کسی کے لئے سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ استحصال اور ارتکاز و احتکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ قرآن ایک ایسے مثالی معاشرہ کی تعمیر کا خواہاں ہے' جس میں رہنے والے ہر شہری کے راستے میں ماسوائے اس کی اپنی اہلیت اور خوف خدا کے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ اپنی زندگی میں وہ فضیلت اور مقام حاصل کر لے جس کا وہ خواہاں اور اہل ہو۔ ایسا معاشرہ صرف توحیدی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہی قائم ہو سکتا ہے۔

مسلمانان عالم کا ایک مرکزی مسئلہ اسلام کے صحیح فہم اور تاریخ کے شعور کا ہے۔ درحقیقت دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی تک مسلمانوں پر آشکار نہیں ہوا۔ اسلام کی روح سرمایہ دارانہ نظام کے منافی ہے جبکہ اسلام کا اشتراکیت کے ساتھ اختلاف محض عملیاتی ہے اور یہ ذاتی ملکیت کے متعلق ہے۔ بہرحال اسلام میں ذاتی ملکیت مشروط ہے فطری نہیں ہے۔ دور حاضر میں مسلمان ممالک کے گھمبیر مسائل کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دنیا کے مراعات یافتہ سرمایہ دارانہ نظام نے اسلام کو اشتراکیت سے نبرد آزما کر کے' اسلام کا رشتہ سرمایہ کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ ہم اشتراکیت کے ساتھ مل کر سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ نبرد آزما ہوتے' کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام ہی ابلیسی نظام ہے۔ بقول علامہ اقبال اسلام تکمیل نہیں بلکہ ایک تمنا اور آرزو ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس تمنا اور آرزو کو حقیقت کی طرف گامزن کریں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انسانی مساوات اور احترام آدمیت کے سہانے خواب کو پورا کر دکھائیں' جو آج بھی بلاد اسلامیہ کی اداس گلیوں میں اپنی تعبیر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت' 9,8,6 دسمبر 2003ء)

طلوع اسلام:۔ (فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اشتراکیت اور اسلام کے مابین تعاون کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ یہ مضمون نگار کے ذاتی خیالات ہیں' جن سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ادارہ)

ولا تفرقوا

رمقؔ کاشمیری

اُس اُمّیؐ لقب کی یہ اُمت نہیں
جو آپس میں یوں محوِ پیکار ہے

ہوئی بٹ کے فرقوں میں یہ پارہ پارہ
وہ ''ناجی'' یہ ''پاجی'' وہ ''غدار'' ہے

اِسی کا صِلہ یہ ملا ہے اب اِس کو
یہاں ہے ذلیل اور وہاں خوار ہے

جو ہونا تھا اِس سے، وہی ہو رہا ہے
اِسی اپنے حق کی یہ حقدار ہے

فلک اِس کی حالت پہ نالاں و گریاں
زمیں اِس کے شرّ سے نگوں سار ہے

بایں خوابِ غفلت، بایں ضعف و ذِلّت
سمجھتی ہے مِلّت کہ بیدار ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملّتِ اسلامیہ کا مقنّنِ اعظم

امام ابوحنیفہؒ

تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے نوع انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے نبوت اور نزول وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور بالآخر حضور رسالتمآب ﷺ کی ذات اقدس و اعظم کے ساتھ یہ سلسلہ حاصلِ تکمیل کو پہنچ گیا۔ قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کو اپنے نظامِ معاشرہ کے لئے جن اصول و اقدار کی ضرورت تھی وہ قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے اور ان کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ نوع انسانی کی ہدایت اور راہ نمائی کے سلسلے میں اس عظیم ترین خدائی فیصلے کے بعد امت مسلمہ کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان اصول و اقدار کی غیر متبدل اور محکم اساس پر، زمانہ بہ زمانہ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر، نظام معاشرہ کی جزئیات طے کرتی ہوئی زندگی کی شاہراہوں پر حفظ و امن سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ دینِ خداوندی کا یہی وہ منشا و مقصود تھا جس کی عملی تشکیل حضور نبی اکرم ﷺ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔ حضور ﷺ نے اپنے دور کی ضرورتوں کے مطابق دین خداوندی کو محسوس پیکروں کی صورت دی اور اس نظام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔ اور جب آپ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپ کے جلیل القدرؓ جانشینوں نے اس نظام کو احسن انداز سے آگے بڑھایا۔ حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ جو نئے نئے تقاضے ابھر کر سامنے آئے ان کے پیش نظر جہاں جزئیات دین میں تبدیلیوں کی ضرورت پیش آئی وہاں ان میں تبدیلی بھی کی گئی۔ اور جہاں ایسی تبدیلی کی ضرورت پیدا نہ ہوئی وہاں پہلے سے طے شدہ جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا۔ یہ سب نظائر اور تبدیلیاں ہماری تاریخ دین کے اوراق میں آج بھی جگمگاتی دکھائی دے رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ ثبات و تغیر کا یہی وہ حسین امتزاج تھا جس کے سہارے ہمارا کارواں کامرانیوں اور شادمانیوں کے جلو میں زندگی کی ارتقائی منزلوں پر قدم بڑھاتا گیا۔ اور جب تک یہ صورت قائم رہی اسلام کی جہانگیری اور عالم آرائی کا سلسلہ ترقی پذیر رہا۔

لیکن ابھی نصف صدی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور اس کے بعد اسلام کی گاڑی جس نئی پٹڑی پر ڈال دی گئی اور دینِ خداوندی کا نقشہ جس انداز سے بدلا گیا اس کی داستانِ غم ہماری تاریخ کا سب سے المناک باب ہے۔ ملوکیت خدا کے دین میں ایک شجر ممنوعہ اور شرفِ انسانی کے لئے ایک جذام کی حیثیت رکھتی ہے اور

اس کا سب سے گھناؤنا کردار یہ تھا (اور ہمیشہ یہی رہا ہے) کہ سیاسی امور و اختیارات حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور مذہبی معاملات پیشوائیت کے سپرد کر دیئے۔ یہ بعینہٖ عیسائیت کے ''قیصر اور کلیسا'' کا سا گٹھ جوڑ تھا جس نے دینِ خداوندی کی ناقابل تقسیم وحدت کو مذہب اور سیاست کی ثنویت میں بدل دیا۔ یہ حکمران اب بھی خلافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے اور صدیقِ اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی طرح خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے القاب اختیار کئے ہوئے۔ لیکن وہ وحدت دین جو ثبات و تغیر کی ہم آویزی سے دین کے نشوو ارتقا کی ضامن تھی زیروزبر ہو کر رہ گئی۔ سیاست کے سلاطین کے ہاتھوں میں منتقل ہو جانے کے بعد زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق' اسلامی اصولوں کی روشنی میں قوانین مرتب کرنے کا اہم فریضہ انفرادی کوششوں کے سپرد ہو گیا۔ انہی کوششوں کا نام اجتہاد ہے اور ہمارے اسلاف میں جن برگزیدہ شخصیتوں نے اس سلسلے میں کدو کاوش کی وہ امت کے امام۔ فقہا اور مجتہدین کہلائے۔

فقہا و محدثین کے اس گروہ میں جو امت میں عقیدت اور احترام کا ایک مخصوص مقام رکھتا ہے' امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا اسم گرامی سرفہرست نظر آتا ہے۔ اور ان کے اجتہاد کو امت میں صدیوں سے جو امتیازی حیثیت حاصل ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ امام موصوف کو ملت اسلامیہ کے عظیم مقنن کا مقام و منصب حاصل ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ عباسی سلطنت کے زیر عتاب تھے اور جیل خانے کی کوٹھڑی میں جان دی لیکن جب ان کا جنازہ اٹھا تو پچاس ہزار سے زیادہ مسلمان اس جنازہ کے ساتھ تھے۔ بغداد کے قاضی شہر حسن بن عمارہ نے انہیں غسل دیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ یہ کہتے جا رہے تھے کہ:

> ''واللہ! تم سب سے بڑے فقیہہ۔ بڑے عابد۔ بڑے زاہد تھے۔ تم میں تمام خوبیاں موجود تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو اس سے مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں۔''

حضرت عبداللہ ابن المبارک جیسی اس دور کی عظیم مذہبی شخصیت نے ان کے مزار پر کھڑے ہو کر بادیدۂ تر کہا:

> ''ابوحنیفہ! خدا تم پر رحم کرے۔ ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ افسوس کہ تم نے پوری دنیا میں کوئی جانشین نہ چھوڑا۔''

ان کی عظمت پر فضل بن عیاض' جعفر بن ربیع۔ ملیح بن دکیع' ابن جریج اور امام مالک (رحمھم اللہ) جیسی شخصیتوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ امام مالکؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

> ''اگر وہ (امام ابوحنیفہؒ) اپنے قیاس سے مسجد کے ان ستونوں کو لکڑی کا ثابت کرنا چاہیں تو تم یقین کر لو کہ یہ واقعی لکڑی کے ہیں۔''

امام ابوحنیفہؒ کی عظمت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے فقہ اسلامی کی باضابطہ ترتیب و تدوین کی سب سے پہلی اور مؤثر کوشش کی اور اسی بنا پر انہیں ''امام اعظم'' کے عظیم القدر خطاب سے نوازا گیا۔ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کی فقہ کا مدار قیاس پر تھا اور قیاس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن

کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے دین کی جزئیات مرتب کی جائیں اور جو لوگ فقہ اسلامی اور اس کی تاریخ کا علم رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے فقہ کی اس عظیم الشان ترتیب میں احادیث سے بہت کم مدد لی۔ اس کی وجہ یہ قطعاً نہ تھی کہ امام موصوف کو احادیث نہیں مل سکتی تھیں یا انہیں علم حدیث پر عبور حاصل نہیں تھا۔ اگرچہ ان کے مخالفین نے ان پر یہ الزام عائد کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ احادیث کے معاملہ میں بے بہرہ تھے لیکن یہ الزام افسوسناک مخالفت کا شاخسانہ تھا اور اس کی تردید کرتے ہوئے شمس الائمہ سرخسیؒ نے لکھا تھا کہ:

''امام ابوحنیفہؒ کی قلتِ روایت کی بنا پر بعض مخالفین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ حدیث سے واقف ہی نہیں تھے۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ وہ تو اپنے زمانے کے حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے لیکن کمالِ ضبط کی شرط ملحوظ رکھتے ہوئے روایت سے بہت کم کام لیتے تھے۔''

(کشف الاسرار۔ جلد دوم۔ ص718)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام موصوف کی قلتِ روایت کی وجہ تھی کہ اس زمانے میں ابھی احادیث کے مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اس دلیل کو بھی غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ اپنے خطبات میں انہوں نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالک اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب 30 سال پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ حنفی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔''

(خطبات اقبال۔ ص164-163)

خود علامۂ محدث امام ذہبیؒ نے اپنی کتاب ''حفاظِ حدیث'' اور حافظ ابو المحاسن دمشقی الشافعی نے اپنی تصنیف ''عقود الجمان'' میں امام اعظمؒ کو بہت بڑا ماہر علم حدیث قرار دیا ہے۔ علامہ ابن خلدون ''فصل علوم الحدیث'' میں لکھتے ہیں:

''فنِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا کبار مجتہدین میں شمار اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے۔''

ابن خلدون نے امام اعظمؒ کے عام روایات کونظر انداز کرنے کے مسلک کا سبب بھی بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ:

"والامام ابو حنیفه انما قلت روایة لما شدد فی شروط الروایة والتحمل۔

یعنی امام ابوحنیفہ کی روایات اس لئے کم ہیں کہ انہوں نے روایت اور تحمل کی شروط میں سختی اختیار کی۔۔۔"

اصل وجہ یہ تھی کہ امام اعظمؒ حدیث کو وحی الٰہی کی طرح نہ تو غیر متبدل سمجھتے تھے اور نہ ہی شک و شبہ سے بالاتر۔ ان کے نزدیک دین خداوندی کی بنیاد یقینیات پر تھی اور احادیث کو یقینیات کا درجہ حاصل نہیں۔ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورے سے فقہ کی تدوین کرتے تھے اور اگر کوئی یہ اعتراض کرتا کہ آپ کا یہ فیصلہ رسولؐ اللہ کی فلاں حدیث کے خلاف ہے تو اس کے جواب میں وہ یہی کہتے جو حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ کا وہ فیصلہ اس زمانے کے لئے تھا اور اس دور کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اور اسی تبدیلی کی بنا پر فیصلے میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ یا وہ حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ کبارؓ کے اتباع میں یہ کہتے کہ کیا معلوم رسولؐ اللہ نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اسے کیا سمجھا؟ ہم کتاب اللہ کی موجودگی میں غیر یقینی چیزوں کو دین کا حصہ نہیں قرار دے سکتے۔ چونکہ وہ اس حقیقت کو واضح اور نمایاں کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ نہ تو یقینی ہیں اور نہ غیر متبدل، اس لئے احادیث کے رد میں وہ بعض اوقات شدت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ابوصالح فراء کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط کو یہ کہتے سنا کہ "امام ابوحنیفہؒ نے رسول اللہ ﷺ کی چار سو بلکہ چار سو سے بھی زیادہ حدیثوں کو رد کر دیا ہے۔" ابوسائب کہتے ہیں کہ میں نے حدیث کے مشہور عالم امام دکیع کو یہ کہتے سنا کہ "ہم نے ابوحنیفہؒ کو دو سو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے پایا۔" عبدالاعلیٰ بن حماد اپنے والد حماد بن سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ "ابوحنیفہؒ کے سامنے رسولؐ اللہ کی حدیثیں آتی تھیں مگر وہ اپنی رائے سے انہیں رد کر دیا کرتے تھے۔" امام احمد بن حنبلؒ نے بھی مؤمل کے واسطے سے حماد بن سلمہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

(تاریخ خطیب، جلد نمبر 13، ص 93-91)

ابواسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس جا کر مسائل جہاد کے متعلق سوال کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا۔ ابوحنیفہ نے اس کا جواب دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اس بارے میں رسولؐ اللہ کا ارشاد تو اس طرح ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا "ہمیں اس سے معاف رکھو۔" علی ابن عاصم کہتے ہیں کہ ہم نے ابوحنیفہؒ کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنائی تو ابوحنیفہ نے کہا کہ "میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ابوحنیفہ نے پھر کہا "ہاں ہاں میں اسے قبول نہیں کرتا۔"

(تاریخ خطیب، جلد نمبر 13، ص 387)

یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے "وضو آدھا ایمان ہے" ابوحنیفہ کہنے لگے۔ "پھر تو دو وضو کر ڈالو تا کہ تمہارا ایمان مکمل ہو جائے"۔ اسی طرح ان کے سامنے یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ "لا ادری (میں نہیں جانتا) کہہ دینا آدھا علم ہے" ابوحنیفہؒ

کہنے لگے کہ ''بس دو مرتبہ لا ادری کہہ دینا چاہئے تا کہ علم مکمل ہو جائے۔''

یہ تھا فقہ اسلامی کے اس امام اعظمؒ کا احادیث کے بارے میں مسلک۔ امام اعظمؒ نے اس مسلک کی تائید میں دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ ''خود رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جزئیات دین کی تعیین میں آپ صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جو رائے بہتر ہوتی اسے اختیار فرما لیا کرتے تھے''۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ''اگر میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوتا تو میں بھی اس مجلس مشاورت میں ہوتا اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری ذاتی رائے کو اختیار فرما لیتے''۔ تاریخ خطیب میں محمود بن موسیٰ اور ابو صالح الفراء کی زبانی یوسف بن اسباط کی یہ روایت قدرے مختلف اور جدا جدا الفاظ میں درج ہے۔

(تاریخ خطیب۔ جلد نمبر 13، ص 390,387)

خطیب نے یہ کچھ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

''میں ایک روز ابوحنیفہ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ مجھ سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا۔ انہوں نے محمد بن حبان سے۔ انہوں نے رافع بن خدیج سے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچو ورنہ اس کا ہاتھ کٹ جائے گا۔ اس پر ابوحنیفہؒ نے بلا تامل کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا۔ چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔۔۔ (ایضاً)۔''

صحابۂ کبارؓ کے اتباع میں امام ابوحنیفہؒ کا یہی وہ مسلک تھا جس کی بنا پر وہ ''اہل الرائے کے امام اعظم'' کہلائے۔ اہل الرائے کے مقابلے میں دوسرا گروہ ''اہل حدیث'' کا تھا۔ چنانچہ اس دوسرے گروہ کے چوٹی کے محدثین نے امام اعظمؒ کی مخالفت میں افسوسناک الفاظ استعمال کئے ہیں اور تاریخِ خطیب میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ امام مالک بن انسؒ نے کہا تھا کہ ''ابوحنیفہ کا فتنہ اس امت کے لئے (معاذ اللہ) ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں۔ دونوں باتوں میں۔۔عقیدۂ ارجاء میں بھی اور احادیث کو رد کرنے میں بھی''۔ عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ ''میں دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنے کو (پناہ بخدا) ابوحنیفہ کے فتنے سے بڑا نہیں دیکھتا۔'' فزاری کہتے ہیں کہ ''میں نے سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''اسلام میں ابوحنیفہ سے زیادہ (خاکم بدہن) بدبخت ترین پیدا نہیں ہوا۔'' قیس بن ربیع سے ابوحنیفہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ''ماضی (روایات و آثار) میں جاہل ترین اور مستقبل (استنباط احکام) کا عالم ترین شخص ہے۔'' عمرو بن قیس کا قول ہے کہ ''جو شخص حق کو معلوم کرنا چاہتا ہے اسے کوفہ جا کر ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب کے قول کو دیکھنا چاہئے۔ اس کے بعد ان اقوال کے خلاف کرنا چاہئے۔'' (کیونکہ وہی حق ہے) بشری

کہتے ہیں کہ ''تم ابوحنیفہ کی مخالفت کرو گے تو حق کو پا لو گے۔'' عمار بن زریق کہتے ہیں ''ابوحنیفہ کی مخالفت کرو۔ تم حق کو پا لو گے''۔ ابن عمار کا قول ملاحظہ ہو۔ کہہ رہے ہیں کہ ''جب تمہیں کسی بات میں شک ہو تو دیکھ لو کہ ابوحنیفہ نے کیا کہا ہے۔ بس اس کی مخالفت کرو کہ حق وہی ہو گا یا یوں کہو کہ اس کی مخالفت میں ہی برکت ہے۔'' ابوعبید سے روایت ہے کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آ گیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں تو سودؒ نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ ''تو مسجد میں ابوحنیفہ کا تذکرہ کرتا ہے۔'' اور مسجد میں ابوحنیفہ کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک پھر مجھ سے کلام نہ کیا۔

معاملہ یہیں پر بس نہیں ہوا بلکہ اور آگے بڑھا۔ تاریخ خطیب میں فقہ حنفی کی مخالفت کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ ممدویہ بن مخلد کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ مدینی سے پوچھا گیا ''کیا وجہ ہے کہ ابوحنیفہ کی رائے سارے شہروں میں گھس گئی ہے مگر مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکی۔'' محمد بن مسلمہ نے جواب دیا کہ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ کی ہر گلی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو مدینہ میں دجال کو داخل ہونے سے روکے گا اور یہ بھی چونکہ دجالوں کا کلام ہے اس لئے وہاں داخل نہیں ہو سکا۔'' (استغفر اللہ)۔

یہ امام اعظمؒ کے بارے میں محدثین کے مشہور بزرگوں کے نقطۂ نظر کا ایک مختصر سا جائزہ ہے۔ مخالفت کا یہ گھناؤنا انداز اس لئے اختیار کیا گیا کہ امام اعظمؒ احادیث کو غیر متبدل قانون کی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اس صورتِ حال پر مصر کے دورِ حاضر کے ایک مشہور عالم ابوزہرا نے اپنی کتاب ''امام ابوحنیفہؒ'' میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ مصر کے اکثر علماء کی طرح ابوزہرا کا تعلق شافعی مسلک سے ہے۔ اس کے باوجود انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

> ''مگر (امام ابوحنیفہؒ کے) مخالفین کی صف میں زیادہ تر وہی لوگ نظر آتے ہیں جو استقلالِ فکری میں ان کے مقابلہ میں عاجز تھے یا ان کے مدارک فقہ تک رسائی سے محروم تھے۔ یا پھر وہ تنگ مزاج مخالفین تھے جو ہر اس طریقِ فکر کو جو اقوالِ اسلاف سے ماخوذ نہ ہو حقِ معروف سے خارج اور بدعتِ منکر خیال کرتے ہیں۔ امام صاحب سے ان کے بھڑکنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کی نظر میں جہاں توقف واجب تھا یا اخذ قلیل سے کام چل سکتا تھا وہاں امام صاحب بے دھڑک رائے اور قیاس کا استعمال فرمایا کرتے تھے.....
>
> امام صاحب کے بعض نکتہ چین وہ ہیں جو ان کی شانِ مروت و اتقا اور علم و فضل سے آشنا نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل وافر، علم گراں بہا، قدر خطیر اور عوام و خواص کی نگاہ میں رتبۂ خاص سے نوازا ہے۔ امام صاحب کی ذات گرامی پر قدح کرنے والوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو اور ان کی کثرتِ کلام کا عالم کچھ ہی کیوں نہ ہو.....مگر یہ

امر واقعہ ہے کہ تاریخ نے اس فقیہہ عراق پر طعن و تشنیع کرنے والوں کے مقابلے میں ہمیشہ انصاف کیا ہے۔ ان کے مقابلے میں بھی جو ان کی زندگی میں مصروفِ افترا تھے اور ان کے مقابلے میں بھی جو موت کے بعد بھی افترا پردازیوں سے باز نہ آئے۔ لوگوں نے گوش ہوش سے ان لوگوں کی باتیں سنیں جنہوں نے امام صاحب کی صفت وثنا بیان کی ہے۔ اسے شہادتِ صدق اور قولِ حق سمجھ کر کہنے والوں کی تعریف کی۔ اور سمجھ لیا کہ دشنام طرازی کی روشن دلیل ہے اس بات کی کہ انسان جب قدر وفکر، اخلاص ومروت اور دین کے لحاظ سے عظمت و رفعت حاصل کر لیتا ہے تو افترا سے محفوظ نہیں رہتا۔ اور یہ چیز اس کی آزمائش اور جزا میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔''

(ص99-100)

اس مکتبِ فقہ کی بارگاہ سے جس نے امام اعظمؒ کے خلاف وہ کچھ کہا تھا جسے ہم (دل پر پتھر رکھ کر) اوپر نقل کر آئے ہیں، یہ خراجِ تحسین امام موصوف کی عظمت کا بہت بڑا اعتراف ہے۔ ساتھ ہی امام ابوحنیفہؒ کی وسعت قلبی اور بلند نگہی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جہاں ان کے مخالفین نے ان کے خلاف یہ کچھ کہا وہاں امام صاحب نے جو نعرہ بلند کیا وہ یہ تھا کہ:

''اے اللہ! جن لوگوں کے سینے ہمارے لئے تنگ ہیں ہمارے سینے ان کے لئے فراخ ہیں۔''

(تاریخ بغداد، جلد نمبر 13، ص 352)

اس مقام پر ایک اور اہم حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ کیا امام اعظمؒ کا منشاء یہ تھا کہ وہ اپنی فقہ کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے بعد فقہ حنفی کی تقلید کرنے والوں نے سمجھ لیا۔ جس شخص کا اپنا عقیدہ یہ ہو کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے فیصلے بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار نہیں پا سکتے وہ اپنے تفقہ واجتہاد کو کیونکر غیر متبدل اور ہمیشہ کے لئے واجب تقلید قرار دے سکتا ہے۔ اس باب میں تاریخی شہادات موجود ہیں کہ امام اعظمؒ نے اسے قطعاً پسند نہیں کیا کہ ان کے اجتہادات کو ابدی حیثیت دے دی جائے۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات کو شدت سے روکا۔ چنانچہ تاریخ خطیب میں مذکور ہے کہ:

''نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ شام کا ایک شخص بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی وطن کو واپس جانے لگا تو رخصت ہونے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا۔ اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے''؟ شامی نے جواب دیا ''ہاں!'' اس پر امام نے فرمایا۔ ''خیال رکھنا! تم بہت بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔'' (جلد نمبر 13۔ص 401) مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ ''جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے۔ جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔'' امام ابوحنیفہ نے فرمایا ''بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ

ہو۔‘‘

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ابو یوسف اور محمد بن الحسن بھی ہوتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہ فیصلے فرماتے ہم ان کو یکجا لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفر کہتے ہیں کہ ایک دن ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا ’’یعقوب تیرا ناس ہو جو کچھ تو مجھ سے سنے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔‘‘ ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً)۔ سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا۔ (فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه) یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو باتوں کو سنتے ہیں پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ (ایضاً 14، ص 352) حسن بن زیاد لؤلوی کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت کے زیادہ قریب ہوگی۔ (ایضاً)۔‘‘

امام اعظمؒ کے یہ اقوال آخر کس حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ کیا ان تصریحات سے صاف طور پر یہ واضح نہیں کہ امام موصوف اپنے اجتہاد کو سہو و خطا سے مبرا نہیں سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ان کی فقہی کوششوں کو حرف آخر کا درجہ دے دیں اور قیامت تک کے لئے اسے امت کا دستور العمل بنا دیں۔

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ امام اعظمؒ نے اپنے اجتہاد کے بارے میں یہ کچھ تصریحات فرمائیں اور اس کے بعد وہ کروڑوں انسان جنہوں نے فقہ حنفی کو اپنا کر انہیں اپنا امام تسلیم کیا وہ اس عقیدہ پر جم گئے کہ فقہ حنفی کی حیثیت غیر متبدل ہے۔ حالات کے تقاضوں کی بنا پر اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ آگے بڑھا۔ اور یہ عقیدہ وضع کیا کہ آیاتِ قرآنی کی وہی تفسیر قابل قبول سمجھی جائے گی جو فقہ حنفی سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفقہ و اجتہاد کا وہ عظیم الشان سلسلہ جس کا آغاز اس مقنن اعظمؒ کے ہاتھوں ہوا تھا منجمد ہو کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ نہ صرف منشائے دین کے خلاف تھا بلکہ ان عظیم مقاصد کے بھی سراسر منافی تھا جنہیں امام اعظمؒ لے کر اٹھے تھے اور جن کے باعث انہیں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ ابوزہرا فقہ حنفی کے اسی افسوسناک انجام کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ’’ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اگر فقہ حنفی میں تخریجِ مسائل کا کام اسی آزادی سے جاری رہتا اور اصحابِ تخریج ائمہ سلف کی طرح فقہی مسائل میں غور و خوض کرتے رہتے تو موجودہ وقت کی دشواریوں پر بھی بخوبی قابو پایا جا سکتا تھا اور کتاب و سنت یا فقہی اصول و قواعد

سے بغاوت اختیار کئے بغیر حالات کے مطابق مسائل کا استنباط ممکن تھا اور یہ آراء یقیناً فقہ حنفی کا ایک جز بننے کی صلاحیت رکھتے۔ لیکن افسوس کہ عوام پر جمود طاری ہوگیا اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ جمود ان کا نہیں بلکہ فقہ اسلامی کا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔''

(امام ابوحنیفہؒ ص695)

آگے چل کر وہ مزید آنسو بہاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

''بدقسمتی کی بات ہے کہ متاخرین نے اس دروازے کو بند کر دیا اور اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی کام نہ رہ گیا کہ ترجیح شدہ اقوال و آراء کو سامنے رکھ کر فتویٰ دے دیا کریں۔ اب یہ اس کے مجاز نہیں رہ گئے کہ جن مسائل میں کوئی نص موجود نہیں ہے ان پر اجتہاد کر کے کوئی رائے قائم کر سکیں۔ ان کے نزدیک مذہب مدون ہو چکا۔ کتابیں مرتب ہو چکیں۔ لہٰذا ہر حنفی پر واجب ہے کہ آنکھ بند کر کے تقلید کرتا چلا جائے۔''

(ایضاً، ص702)۔

علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے خطبات میں اس افسوسناک صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے جو عہدِ رسالتؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلے میں نافذ ہوئے۔''

(خطباتِ اقبالؒ۔ اسلامی قانون شریعت میں اصول ارتقاء)۔

سچ پوچھئے تو امام اعظمؒ اور ان کے رفقائے جلیل کی عظیم الشان اجتہادی کاوشیں ہمارے لئے اس مرحلہ پر نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پاکستان پہلے دن سے اسلامی قوانین کی ازسرنو تشکیل کی اہم ضرورت سے دوچار ہے۔ ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ اس راہ میں ایک مستقل روک بن کر کھڑا ہے۔ اپنی قدامت پسندی اور تفرقہ بازی کے باعث وہ نہ خود اس کا کوئی متفق علیہ حل پیش کرنے کے قابل ہے اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان حالات میں اس مرحلہ کو کامیابی سے طے کرنے کی واحد صورت وہی ہے جس کی نشان دہی امام اعظمؒ نے فرمائی تھی اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی پابندی اختیار کرتے ہوئے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین کی تشکیل باہمی مشاورت سے عمل میں لائی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ قدامت پرستی کے شور و شر کے پیش نظر یہ راہ اختیار کرنے میں بڑی جرأت اور ہمت درکار ہے۔ لیکن ایسا کئے بغیر ہم ایک قدم بھی کامیابی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ علامہ اقبالؒ اسی سلسلۂ تفصیل میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دور حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے

اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہِ ناراضی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔''

(خطبات اقبال۔ص156)

اس سلسلے میں انہوں نے مزید بتایا ہے کہ:

''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام میں مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا محسن بھی.....

افسوس کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔ میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت کبھی نہیں آیا۔''

(اقبال نامہ۔جلد اول۔ص50)

لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ وقت اب یقینا آ گیا ہے جس کے متعلق علامہ مرحوم نے اپنے خطبات میں یہ پیشگوئی کی تھی کہ:

''یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقینا اثبات میں ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولؐ اللہ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ۔حسبنا کتاب اللّٰہ۔''

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خطبہ کے اختتام پر فرمایا تھا کہ:

''اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے۔ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ (ختم نبوت کے) بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔''

ارضِ پاکستان اس انتظار میں ہے کہ پھر کوئی عمر فاروقؓ۔ امام اعظمؒ اور اقبالؒ کی روح کو لے کر اٹھے اور قانون سازی کے سلسلے میں، اس مملکت کو اس طلسم پیچ و تاب سے نجات دلائے جس میں یہ بدقسمتی سے ستاون برس سے بری طرح گرفتار چلی آ رہی ہے اور جس سے نکلنے کی ابھی بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

دین کس طرح مذہب میں بدلا گیا

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آخری خلیفہؓ کے بعد ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے گٹھ جوڑ سے دین (اجتماعی نظامِ زندگی) کو کتاب اللہ کے اپنی اصلی حالت میں موجود ہوتے ہوئے دیگر مذاہب (خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق) کی طرح مذہب کیسے بنا دیا گیا؟ اس کام کے لئے انہیں نہ تو میدان جنگ میں جانا پڑا اور نہ ہی جدوجہد کی ضرورت پیش آئی۔ اذان میں ''فلاح'' کا ترجمہ نجات اور قرآن میں ''عبادت'' کا ترجمہ محکومیت کی جگہ پرستش (Worship) لکھ کر اور روایات کی رو سے ''اللہ و رسولؐ'' کی واحد اطاعت کو دو الگ الگ اطاعتیں قرار دے کر مسلمانوں کو دین کی پٹڑی سے اتار کر مذہب کی پٹڑی پر ڈال دیا گیا۔ رسول کریم ﷺ اور اصحابؓ رسول اللہ کے دور میں نماز کے اجتماعات جو ذریعہ تھے مشاورت اور دین اللہ کے قیام و بقا کے، ان فرائض کی ادائیگی کا مقصد ''بے مثل و لامکاں اللہ کی اطاعت کی بجائے'' عرش (تخت) پر بیٹھے ایرانی مجوسیوں کے تصوراتی خدا کو خوش یا راضی کر کے نیکیاں حاصل کرنا، جمعہ کی نماز میں فرشتوں کی آمین کے ساتھ آمین ملانے سے اسی (۸۰) اسی (۸۰) سال کے گناہ بخشوانا، جنت کی چابی پر قبضہ جمائے رکھنا، فرائض میں کوتاہی سے یوم آخرت ثواب اور نیکیوں کے پلڑے میں وزن کی کمی پوری کرنے کی خاطر ملاوٹ کے لئے نفلوں کا ذخیرہ کرنا (روایت) اور اپنی اپنی نجات قرار دے دیا گیا۔

عربی زبان میں فلاحۃ کاشتکاری اور کھیتی باڑی کو کہتے ہیں۔ چونکہ فَلّاح (کسان) کی محنت کا صلہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت ایک ایک دانہ کے بدلے سو سو دانوں سے اس کی جھولیاں بھر دیتی ہے، اس لئے فَلَاح کا لفظ کامیابی اور بقاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اذان میں حی علی الفلاح کا مطلب تھا زندگی کامیابی کے ذریعے جینے کا نام ہے۔ اس سے پہلے حی علی الصلوٰۃ کے معنی تھے زندگی نظامِ الصلوٰۃ کے ذریعے جینے سے ہے۔ ازاں بعد دوڑو نماز کے لئے دوڑو نجات کی طرف ہو گئے۔

قرآن کریم نے انسانی سعی و عمل کا حاصل ''نجات'' نہیں بتایا۔ نجات کے معنی ہوتے ہیں کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینا۔ یعنی یہ صرف سلبی (Negative) چیز ہوتی ہے۔ ایک شخص اچھا بھلا بیٹھا ہے۔ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا۔ اس کے بعد اس نے دوڑ دھوپ کی اور اسے

اس سے نجات مل گئی۔ اس طرح وہ شخص پھر اپنی اصلی حالت میں پہنچ گیا۔ اس دوڑ دھوپ سے اسے کوئی مثبت (Positive) فائدہ نہیں ہوا۔ دنیائے مذاہب میں زندگی کا مقصد ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہے جن میں انسان گرفتار ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس چیز کو مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک ان تباہیوں سے بچ کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے (Positive Achievement) کا نام کامیابی ہے۔ یہ مثبت کامیابی' اس دنیا میں سربلندی اور سرفرازی کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت۔

قرآن کہتا ہے کہ نوح علیہ السلام سے لے کر آخری پیغمبر ﷺ تک تمام انبیائے کرامؑ نے ماانزل اللّٰہ کے مطابق ایک ہی دین قائم کیا تھا اور ان کی اطاعت کرنے والے کامیاب ہوئے تھے۔ آج دنیا میں ہم مسلمان جو ذلیل وخوار اور سرنگوں پھر رہے ہیں تو اس کی وجہ دین نہیں' انسانوں کا خودساختہ مذہب ہے جس کو ہم نے گلے لگا رکھا ہے۔ دین اللہ کا اتباع کرنے والے کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر تم مومن رہے تو تم اقوام عالم پر غالب رہو گے۔ یہ پیمانہ ہے عملاً مسلم ہونے کا۔ نجات عیسائیت کا تصور ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر ابن آدم پیدائشی طور پر اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے آتا ہے۔ اور اس کثافت سے اس کا چھٹکارا ناممکن ہے جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لے آئے۔ اس طرح ان گناہوں سے چھوٹ جانا ان کے ہاں نجات (Salvation) ہے۔ یا ہندوؤں کا تصور ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا کے جیل خانے میں محبوس ہے۔ اس قید و بند سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام مکتی (نجات) ہے۔ نجات کا وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے جس کی رو سے (یہودیوں کی طرح) سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے (یا پاک صاف ہونے کے لئے) کچھ وقت کے لئے جہنم میں جائے گا اور پھر وہاں سے چھٹکارا پا کر جنت میں چلا جائے گا۔۔۔ یہی تصور بدھ مت میں ہے۔ ویدانت (تصوف) کی رو سے بھی انسانی سعی و کاوش سے یہی مقصود ہے۔ یہی تصوف مسلمانوں نے اپنا لیا۔ یعنی انسان کی روح اپنی اصل (ذات خداوندی) سے الگ ہو کر مادہ کے دلدل میں پھنسی ہوئی چیخ رہی ہے۔ اس کا اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی اصل سے جا ملنا مقصود حیات ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ حضرت پیر و مرشد واصل باللہ ہو گئے۔ آپ کا وصال ہو گیا۔ یہ قرآن کریم کا دیا ہوا تصور نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں صاف سلیٹ لے کر آتا ہے۔ اسے فطرت کی طرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی ہیں اس میں ''کچھ بننے'' کی امکانی وسعتیں (Realiseable Possibilities) ہوتی ہیں ان (Potentialities) کو مشہود بنانا (Actualised کرنا) مقصودِ حیات ہے۔ تاکہ انسان اس زندگی سے بلند تر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ مقصود زیست As you were ہونا نہیں۔ ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ہے۔ زمین کی زندگی

انسان کی تربیت گاہ ہے۔ اس میں اس کی ذات کی نشوونما (Development) ہوتی ہے۔جس سے یہ اس دنیا کی تمام خوشگوریاں' کامرانیاں اور کامیابیاں حاصل کر لیتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی۔ یہ سب مثبت نتائج ہیں۔اس لئے انہیں ''فلاح'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔یعنی کھیتی کا پروان چڑھنا اور ثمر بار ہونا۔لہٰذا اس دنیا (اشیائے کائنات) کو مسخر کر کے اس کی نعمتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما اور انسانیت کی فوز و فلاح حاصل کرنا مقصود حیات ہے۔

قرآن کریم میں ایمان لانے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اس نظامِ قرآنی کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں ((2/3۔ پھر وہ اس نظام کو عملاً متشکل کرتے ہیں اور جب اس کے مرئی ومحسوس نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں تو ان کا ایمان بالغیب یقین میں بدل جاتا ہے ((2/4۔ ان کی مثال اس کسان (فلاّح) کی سی ہے جو اپنے یقینِ محکم کی رو سے بیج کو مٹی میں ملا کر مہینوں اس پر محنت کرتا رہتا ہے اور بالآخر اس کی محنت کے نتائج فصل بن کر اس کے سامنے آجاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔جنہیں اس دنیا میں بھی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور مستقبل میں بھی۔

والسلٰم علیٰ من اتبع الھدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ڈاکٹر سید عبدالودود (مرحوم)

طلوعِ اِسلام نے کیا دیا؟

[یہ وہ حقیقت کشا اور حیات انگیز خطاب ہے جو 19 اپریل 1959ء کی شب کو ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ایم۔سی مرحوم و مغفور نے طلوع اسلام کنونشن میں دیا۔ خلوص میں ڈوبی ہوئی مردِ مجاہد کی یہ آواز ایوان کو فکر و نظر کی ان گہرائیوں میں لے گئی جہاں زندگی، اس کے مقاصد، اور جانکاہ فرائض بے نقاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ خود پرویز صاحب اس خطاب کے دوران میں تاثر میں ڈوبتے چلے گئے اور خطاب کے خاتمے پر نعرۂ تحسین بلند کرتے ہوئے اسٹیج پر آئے اور ڈاکٹر صاحب کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ملت قابل مبارک ہے کہ اس میں ایسے فکر خالص رکھنے والے مرد مجاہد موجود ہیں اور یہ کہ وہ خود کو بالخصوص قابل مبارکباد سمجھتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ قرآنی فکر کے سمجھنے والوں میں ڈاکٹر موصوف جیسے مخلص اور مجاہد بھی شامل ہیں۔]

جن اصحاب کو طلوع اسلام کے ساتھ دلچسپی ہے میں ان سے اکثر سوال کرتا ہوں کہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں وہ کونسی چیز ہے جو آپ کو پسند ہے۔ مختلف لوگوں کے مختلف جواب ہوتے ہیں۔ بعض بہنیں یہ کہتی سنی گئی ہیں کہ ''طاہرہ کے نام خطوط'' میں جو عائلی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بے نظیر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''سلیم کے نام خطوط'' کا انداز بڑا دلکش ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''انسان نے کیا سوچا'' میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ اکثریت ان احباب کی ہے جو ''نظام ربوبیت'' کے دلدادہ ہیں۔ ایک صاحب نے جو طلوع اسلام کی اکثر مخالفت کرتے ہیں لیکن جب مجھ سے ملتے ہیں تو انداز گفتگو ذرا مختلف ہوتا ہے کہا کہ ہاں ''معراج انسانیت'' میں جو مستشرقین کی آراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اکٹھی کی گئی ہیں وہ بڑی دلچسپ اور قابل داد ہیں۔ ایک صاحب نے الٹا مجھ پر سوال کر دیا کہ تم خود بتاؤ کہ تمہیں طلوع اسلام کی کونسی ادا پسند ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے جس چیز نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ Attract کیا وہ اسلامی نظام کا نقشہ اور پھر نظامِ ربوبیت ہے لیکن میرے خیال میں یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ صرف ہماری اپنی اپنی میلان طبع کا اظہار ہے۔ بہتی ندی میں سے ہر ایک اپنی اپنی Capacity کے مطابق چلو بھر لیتا ہے ورنہ انسانی زندگی کا وہ کونسا پہلو ہے جس پر قرآن نے روشنی نہیں ڈالی اور قرآن کا وہ کونسا گوشہ ہے جسے طلوع اسلام نے بے نقاب نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ طلوع اسلام کا قوم پر جو سب سے بڑا احسان ہے وہ یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دی ہے۔

حضرات! آپ کو قائداعظم کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب تقسیم ملک سے پہلے وہ ایک مرتبہ نواب بھوپال سے ملنے گئے۔ واپسی پر نواب صاحب نے قائداعظم کے ہمراہ اپنے ایک سیکرٹری مسٹر سین کو بھیجا۔ راستہ میں اس شخص نے قائداعظم سے سوال کیا کہ جناب ملک کی فضا اس وقت خراب ہے ہر طرف افراتفری اور سیاسی بے چینی پائی جاتی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟ قائداعظم نے کہا کہ مسٹر سین آپ خود ہی بتائیے کہ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے۔ مسٹر سین نے کہا کہ جناب میرے خیال میں قوم کے اندر Clear Thinking نہیں رہا۔ قائداعظم نے فوراً پلٹ کر جواب دیا کہ مسٹر سین میں اس وقت سیدھا بمبئی جا رہا ہوں۔ اگر واپس نواب صاحب کے پاس جانا ہوتا تو ان سے کہتا کہ وہ آپ کو ایک بہت بڑی جاگیر بخش دیں۔ حضرات! قوم کے اندر Clear Thinking کا پیدا ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج فضا بدل رہی ہے۔ بڑی تیزی سے نہ سہی بہرحال بدل رہی ہے۔ آپ پریس اور پلیٹ فارم پر تحریروں اور تقریروں کے انداز سے سمجھ رہے ہیں کہ آج سے چار پانچ سال پیشتر کی فضا کیا تھی اور آج کیا ہے۔ اس وقت ملک کا Intelligentsia اسلامی ریاست کے تصور سے کانپتا تھا۔ اخبارات میں کھلم کھلا 'اسلامی ریاست' کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے اور لوگوں کے مزاج میں بڑی تندی تھی۔ مثال کے طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ 55ء میں جس وقت ہماری دوسری آئین ساز اسمبلی ایک اسلامی آئین بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی' لاہور کے ایک انگریزی ہفتہ وار نے جو کچھ لکھا تھا میں اس کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکیں گے کہ اس وقت اسلامی آئین کی مخالفت کی شدت کس قدر تھی۔ اس اخبار نے لکھا کہ یہ اسلامی ریاست ہے کیا؟ اور اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ کیا یہ موجودہ جمہوری تقاضوں کو پورا کر سکے گی؟ پھر لکھا کہ یہ اسلامی ریاست کے تصور ہی کے طفیل ہے کہ عرصہ آٹھ سال سے ملک کا آئین تیار نہیں ہو سکا۔ اس اسلامی ریاست کے تصور نے دنیا کے سامنے ہمیں اضحوکہ بنا کر رکھ دیا ہے اور باہر کی دنیا کو ہم کیسے جھٹلا سکتے ہیں جب وہ ہمیں Sentimental Fools یعنی جذباتی بے وقوف کہہ کر پکارتے ہیں اور ہمیں Religious Extremists یعنی مذہبی انتہا پسند کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہبی دیوانگی خوراک ہے۔ کٹر پن وہاں کا قاعدہ ہے اور مذہب لوگوں کی افیون ہے۔

Fanaticism is the food, orthodoxy the rule and religion the dope.

پھر اس نے لکھا کہ ہم مذہبی بحثوں میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو کافر بنانے میں اس قدر مست ہیں کہ ہم دنیا کے دیگر مسائل سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ فلاں چیز اسلامی ہے اور فلاں غیر اسلامی۔ فلاں مسلمان ہے اور فلاں کافر۔ اس کے سوا دنیا میں ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں اور ہماری نظر مذہبی دیوانگی پر ایسی جمی ہوئی ہے کہ ہم کبھی اسلام کے پیروؤں کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور ہم اپنے باپ داداؤں کے کارناموں پر اس قدر مست ہیں کہ ہمیں مستقبل کی خبر نہیں۔ اس نے پھر لکھا کہ ہمارا اسلامی سال بھی رونے پیٹنے سے شروع ہوتا ہے اور کوئی دھیان نہیں دیتا کہ اس رونے پیٹنے سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ اگر ہم نے رونا ہے تو کیوں نہ ہم ان پاکستانی مسلمانوں کے لئے روئیں جو مر مر کر زندہ رہ رہے ہیں۔ جو

روٹی کے ٹکڑوں اور چیتھڑوں کے لئے ترس رہے ہیں اور کیوں نہ ان کے لئے روئیں جو کام کرنا چاہتے ہیں لیکن کام نہیں ملتا اور ان بچوں کے لئے روئیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ زندہ باپ کے یتیم بچے ہیں اور اگر ہم نے ٹسوے بہانے ہیں تو کیوں نہ ان مریضوں کے لئے بہائیں جنہیں نہ دوا میسر ہے نہ خوراک اور کیوں نہ ان لولے لنگڑوں کے لئے بہائیں جو خستہ حالت میں سڑکوں پر پڑے ہیں۔ پھر لکھا کہ مذہبی ریاست کا تصور ہمیں وہاں لے آیا ہے جہاں ہم انسانوں کی طرح رہنا بھول چکے ہیں۔ یہ اسلامی ریاست کی تلاش جنگی بطخ کے شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ پہلی آئین ساز اسمبلی کے بنیادی اصولوں کی سفارشات کے متعلق اس نے لکھا کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفوں کو یقین ہے کہ موجودہ جمہوری اصول پاکستان کے لوگوں کے موافق نہیں۔ یہ مسودہ پاکستان کی ذلت اور جمہوریت کی توہین ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ انسانی حقوق کی نفی ہے اور آزادی کے منہ پر ایک تھپڑ ہے۔ یہ دوبارہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی ایک مکارانہ چال ہے۔ یہ دوغلی دستاویز ہے جس میں ہر ایک اچھی چیز غائب ہے اور ہر بری چیز کی نقل ہے۔ لوگ ان دقیانوسی چیزوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چاہے انہیں اسلامی کہا جائے یا غیر اسلامی۔ ہم نے غیر ضروری طور پر اسلام کے گھوڑے کو اپنی سیاسی گاڑی کے آگے جوت رکھا ہے۔ حضرات! یہ تھے آج سے چار سال پہلے کے خیالات جو تعلیم یافتہ پاکستانی نوجوانوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طبقہ کی اسلام سے برگشتگی ملا ازم کے خلاف کتنا بڑا Reaction ہے۔ ملا کی پریشاں خیالی کا Reaction بھی کتنا پریشان کن ہے۔ یہ تھی وہ فضا جس کو درست کرنے میں طلوع سلام مسلسل کئی برسوں سے مصروف کار ہے۔ اسی اخبار میں جس کا میں ذکر کر چکا ہوں آرٹیکل شائع ہوتے رہے جو طلوع اسلام کے خیالات کی ترجمانی کرتے رہے اور دو اور دو چار کی طرح بتاتے رہے کہ اسلامی ریاست کے متعلق جو گھناؤنا تصور پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر غلط ہے جس چیز کو اسلام کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ دراصل اسلام سے کس قدر دور ہے۔ وہ ایک پردہ ہے جو اسلام اور مسلمان قوم کے درمیان حائل ہے۔ وہ اسلام کے جسم میں ایک بہتا ہوا ناسور ہے جو اسے نڈھال کر رہا ہے اور یہ کہ اسلام پوجا پاٹ کا معاملہ نہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ یہ ایک سوشل آرڈر ہے۔ یہ سوشل آرڈر کی بجائے مذہب میں تبدیل اس وقت ہوا جب اس کی مرکزیت جاتی رہی۔ جب رسول ﷺ کا Successor کوئی باقی نہ رہا۔ جب امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والا امت کا کوئی نمائندہ باقی نہ رہا جب Church and State دو جدا جدا Institutions بن گئے۔ یہ پھر سے سوشل آرڈر بن سکتا ہے۔ اگر مرکزیت لوٹ آئے۔ اگر رسول کے Succession کے سلسلہ کو پھر سے قائم کر دیا جائے۔ اگر پیشوائیت جو اپنی طبعی موت مر رہی ہے اسے دفن کرنے کا جلد انتظام کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی آئین بنانا کس قدر آسان ہو جاتا ہے اگر اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ Islamic Social Order درحقیقت Permanance اور Change کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ اگر اپنے موجودہ مسائل کی جزئیات کو قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر باہمی مشاورت سے طے کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی طرزِ زندگی اور غربت و افلاس ایک

دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں غربت و افلاس بے کسی اور بے بسی ہے وہاں اسلام نہیں۔

حضرات! لاہور کے پبلک جلسوں میں آج سے چند سال پیشتر کھلم کھلا زمینداروں اور جاگیرداروں کی حمایت کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے قارونوں کی حمایت میں ہامانؔ بڑی بے حیائی سے اپنا So-called اسلام پیش کرتے تھے اور مترفین اپنی انجمنوں کے نام بڑے دلکش' مثلاً شرعی زرعی اصلاحات وغیرہ وغیرہ رکھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مترفین کا گروہ اسلام کا پیدا کردہ ہے۔ اور صرف اسی ایک وجہ سے ہمارا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے متنفر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن جب پبلک جلسوں میں نظام ربوبیت پیش ہونے لگا تو باوجود اس کے کہ یہ نقارخانے میں طوطی کی آواز تھی لوگوں نے کھڑے ہو کر کان لگانا شروع کیا کہ یہ نئی چیز کیا ہے۔ آہستہ آہستہ عوام کی طرف سے یہ مطالبات بھی ہونے شروع ہو گئے کہ وہ اس آواز کو بار بار سننے کے خواہشمند ہیں۔ اخبارات میں جب اِکے دُکے مضامین اس موضوع پر نکلنے شروع ہوئے تو لوگوں نے اس میں دلچسپی لی۔ گذشتہ دو ایک سالوں میں محترم پرویزؔ صاحب کے دورے جو ملک کے اس حصے میں ہوئے ان کا بھی نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ آج ملک کے چوٹی کے اخبارات باوجود اس کے کہ یہ آواز ان کی پالیسی کے مطابق نہیں بادل ناخواستہ ہی سہی اس میں حصہ ضرور لیتے ہیں۔ آج ملک کا Intelligentsia کم از کم یہ کھڑا ہو کر سوچنے ضرور لگا ہے کہ یہ آواز کیا ہے۔ یا کم از کم ان کے جذبات میں اسلام کے خلاف وہ تندی موجود نہیں جو پہلے تھی۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہیں میں بڑی مدت سے جانتا ہوں وہ ایسے لوگ تھے جو اسلام کے نام سے بڑے بیزار تھے۔ لیکن اب وہ کم از کم اس مرحلہ سے نکل چکے ہیں جس میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلامی ریاست کا تصور جنگلی بطخ کے شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تھوڑی بہت تبدیلی اس لئے ہے کہ قوم کے سامنے ایک واضح چیز پیش کی جا رہی ہے جس میں نہ الجھاؤ ہے اور نہ پریشان خیالی۔ لیکن حضرات! میں آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا کہ طلوع اسلام کا مشن بڑا کامیاب ہو چکا ہے۔ اس حد تک تو کامیاب ہے کہ ایک خوشبو ہے جو پھول سے باہر آ چکی ہے لیکن اس مشن کو کامیاب بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے کام Single-handed نہیں ہو سکتے۔ ایک مفکر اپنی دھن میں لگا ہوتا ہے وہ افکار کی دنیا میں بستا ہے اور ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتا جاتا ہے۔ ان افکار میں اگر صلاحیت موجود ہو تو وہ اپنے اثرات خود بخود چھوڑ جاتے ہیں لیکن مفکر بذات خود اس سے بے نیاز ہوتا ہے کہ کون اس کی طرف توجہ دیتا ہے اور کون نہیں۔ جو لوگ ان افکار سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس مفکر کے ہم سفر بننے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ ان کا کام ہے کہ اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لیں۔ اور اس کے پیغام کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ان Ideals کو اپنانے کے بعد ان کا کام صرف یہی نہیں رہ جاتا کہ کتابیں پڑھتے رہیں۔ لیکچر سنتے رہیں اور خراج تحسین ادا کرتے رہیں۔ یہ بقول شخصے ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔ جو لوگ محترم پرویز صاحب کے رفیق کار بننے کے متمنی ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ اس مشعل کو جو انہوں نے ان کے ہاتھ میں دی ہے لے کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں اور' اگر' اور جب ممکن ہو سکے ملک کے باہر بھی اس روشنی کو پھیلائیں۔ حضرات! اگر ارادہ مضبوط ہو اور آنکھیں کھلی ہوں تو قدرتی طور پر ایسے مواقع ابھرا بھر

کر سطح پر آتے رہتے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پریس' پلیٹ فارم و دیگر ممکن ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے لیکن افسوس کہ طلوع اسلام کی بزموں نے ابھی تک اس بات کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ آپ حضرات میں اکثریت ان احباب کی ہے جو اچھے پڑھے لکھے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اچھا لکھ سکتے ہیں۔ اچھا بول سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پریس میں اہمیت اس چیز کو حاصل ہوتی ہے جو حالات حاضرہ کے مطابق ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسا ملکی مسئلہ ہو جس پر قرآن کی روشنی میں تبصرہ کی ضرورت نہ ہو۔ ایک سنجیدہ تبصرہ کا ہر اخبار خیر مقدم کرتا ہے اور حکومت وقت بھی اس چیز کی خواہشمند ہے کہ تعمیری تبصرہ پبلک کی طرف سے پریس میں آئے۔ چنانچہ مواقع بے شمار ہیں' صرف ارادہ' ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ میں گذارش کر چکا ہوں کہ یہ کام Single-hand کرنے کا نہیں۔ اشد ضروری ہے کہ چند ذہین اور باہمت نوجوان اپنی زندگی اس کے لئے وقف کریں۔ ادارہ میں کچھ عرصہ زیر تربیت رہیں اور اس کے بعد ملک کے گوشوں میں پھیل جائیں۔ محنت مشقت اور جان و مال کی قربانی کے بغیر حضرات! کوئی کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

اور یہ بھی اشد ضروری ہے کہ شہروں کے علاوہ دیہات کی طرف توجہ دی جائے۔ اس کے لئے سستے اور عام فہم لٹریچر کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ آپ نے کسی ذاتی یا سیاسی مقصد کے لئے نہیں کرنا' بلکہ ایک دینی فریضہ ادا کرنا ہے۔

حضرات! میں گذارش کر چکا ہوں کہ طلوع اسلام کا قوم پر بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دی ہے۔ طلوع اسلام کی تعلیم کا' جو دراصل قرآن ہی کی تعلیم ہے ایک نمایاں اور مفید ترین پہلو یہ ہے کہ یہ فرقہ پرستی کے خلاف ہے اور اس نے ایسا فارمولا قوم کے سامنے رکھا ہے جس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ قوم کے اندر وحدت پیدا کرنے کا طریق کیا ہے۔ میں اس وقت نظریات پر بحث نہیں کر رہا کیونکہ یہ چیزیں آپ حضرات کے سامنے تفصیل کے ساتھ آ چکی ہیں کہ قرآن فرقہ پرستی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ محترم پرویزؔ صاحب نے نہ صرف از روئے قرآن فرقہ پرستی کو شرک ثابت کیا ہے بلکہ فرقہ پرستی کی لعنت کو دور کرنے کے لئے طریق کار بھی متعین کیا ہے جب انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ پہلے فرقے ختم ہوں اور پھر اسلامی آئین بنے بلکہ پاکستان کے آئین میں یہ شق داخل کی جائے کہ فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے جس میں آج کل مرحوم سیاسی پارٹیاں مدفون ہیں۔ لیکن میرا مقصد اس وقت صرف یہ گذارش کرنا ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو صدیوں کے بعد مسلمان کے سامنے پھر سے بے نقاب ہو کر آئی ہے اور یہ وہ سچائی ہے کہ آج نہیں تو کل بالآخر امت مسلمہ کو اس پر آنا پڑے گا اور فرقہ پرستی اپنی طبعی موت مر کے رہے گی اور یہ وہ دن ہو گا جب قوم کا ہر فرد محترم پرویز صاحب کا شکر گزار ہو گا اور یہ دن قوم کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھے گا۔ حضرات! اس ضمن میں ایک گزارش آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال کے مطابق بڑی اہم ہے۔ اس برصغیر میں بہت سی سیاسی اور غیر سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ ان میں سے ایسی تحریکیں بھی تھیں جو بڑے نیک مقاصد لے کر اٹھیں۔ ابتداء میں ہر ایسی تحریک پوری قوم کی تحریک بن کے ابھری۔ فرقہ پرستی کے خلاف رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ سمٹ سمٹا کر خود ایک فرقہ بن کے رہ گئی اور اس شدت سے فرقہ بنی

کہ اپنے اندر سوائے ان لوگوں کے جو پہلے سے موجود تھے کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتی تھی۔ مجھے ان چیزوں کا ذاتی تجربہ ہے۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس برصغیر میں جو مفکرین گزرے ہیں ان میں علامہ اقبال مرحومؒ نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ اس لئے کہ وہ اپنے فکر کو عام کرتے گئے لیکن انہوں نے کوئی الگ جماعت نہیں بنائی۔ ایک تنظیم مقصود بالذات نہیں ہونی چاہئے بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہونا چاہئے۔ ہم خیال اصحاب کا کبھی کبھی مل بیٹھنا ضروری بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔ لیکن یہ اجتماعات صرف حصول مقصد کے لئے ہونے چاہئیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں محترم پرویز صاحب کے ہاں ہر جمعہ کی شام کو ایک کلاس ہوتی تھی جس میں مختلف قرآنی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ چونکہ اس کلاس کا وقت تین بجے شام یعنی جمعہ کی نماز کے فوری بعد ہوتا تھا۔ اس لئے ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ جمعہ کی نماز شہر میں پڑھنے کی بجائے یہیں (یعنی پرویز صاحب کے مکان پر) پڑھ لیا کریں۔ پرویز صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ہاں' مسجد قریب ہے یہاں آ کر پڑھ لیا کریں۔ بات بظاہر بڑی چھوٹی سی تھی اور آئی گئی ہوگئی لیکن دراصل ایک بہت بڑے راز کی حامل تھی۔ حضرات! اگر ہم نے جمعہ کی نماز کا اجتماع الگ شروع کر دیا تو سمجھئے کہ فرقہ بندی کی طرف پہلا قدم اٹھ گیا۔ چنانچہ یہ بڑی اہم بات ہے کہ تعلیمی اور مشاورتی امور کے علاوہ ہم ہر مسجد اور ہر سوسائٹی میں پھیل جائیں اور کوئی مسلمان چاہے اسے نظریات سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو ہم سے دوری محسوس نہ کرے۔

حضرات! گزشتہ چند صدیوں میں سائنس نے ہر شعبہ میں بے انداز ترقی کی ہے۔ جہاں اس کے اکثر شعبے ایسے ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں وہاں چند شعبے ایسے بھی ہیں جن کی ترقی سے انسانیت کے لئے بڑے خطرات پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے بھروسے پر ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ انسان آج ستاروں کی دنیا سے آگے جانے کی فکر میں ہے لیکن انسانیت کے مسائل ابھی جوں کے توں پڑے ہیں اور انسان کی عظیم سائنٹفیک جدوجہد کا ماحصل ناکامی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے ذہن انسانی آج بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو دو چیزیں ایسی نظر آئیں گی جن کا انسان کے درجۂ انسانیت کو بلند کرنے میں بڑا حصہ ہے۔ مذہب اور سائنس۔ جس وقت بھی دنیا پر تاریکی چھائی کوئی نہ کوئی نبی مشعل راہ لے کر نمودار ہوا۔ سوسائٹی کی اصلاح کی۔ جہالت کو دور کیا نسلی اور جغرافیائی حدود کو توڑا اور انسانیت کو کامیابی اور سربلندی کا راستہ دکھایا۔ لیکن آج کا مذہب جہاں انسانی ذہن پر زنگار کا کام دے رہا ہے وہاں سائنس سے بھی سوائے Perversion کے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ انسان پھر اس حقیقت کو فراموش کر چکا ہے کہ کان الناس امۃ واحدۃ۔ مذہب آج کیوں بے اثر بن کر رہ گیا ہے۔ آج بیسویں صدی کے علم کے پیاسے اور طاقت کے بھوکے انسان کو کیوں مذہب سے رغبت نہیں رہی؟ اس لئے کہ مسلمان کی تراشیدہ ڈاڑھی۔ گرجے کی گھنٹی اور برہمن کی مالا میں ایک Scientific Mind کے لئے کوئی جاذبیت موجود نہیں۔ اس لئے آج کا سائنٹسٹ مذہب کو ایک بے حقیقت شے سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اہل مذہب کے نزدیک سائنس ایک ایسی شے ہے جس نے انسان کو خدا سے دور کر دیا ہے۔ لیکن آج اہل مذہب کا اہل سائنس کے خلاف آواز اٹھانا چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے۔

کیونکہ ایسی طاقت جس نے ارتقائے انسانی میں ایک بڑا اہم رول Play کیا ہو اسے گھٹیا قرار دینا اور اس کی مخالفت کرنا سوائے حماقت کے اور کیا ہے بالخصوص جب مخالفت ایک ایسے فریق کی طرف سے ہو جس میں ایک مذہب دوسرے کے خلاف، ایک مذہب کا ہر فرقہ دوسرے کے خلاف اور ایک فرقے کے افراد کا انداز فکر الگ الگ ہو۔ دوسری طرف سائنس جس کے اصولوں کی حیثیت Universal ہو، جس میں ہر اصول کو ایک کسوٹی پر پرکھا جائے اور ساری سائنٹیفک دنیا اسے بیک وقت اپنائے، تو ایسی صورت میں اہل مذہب اہل سائنس کے آگے کیسے ٹھہر سکتے ہیں اس کا نتیجہ Intelligentsia کے اندر مذہب سے بیزاری ہے۔ گو اہل مذہب جہلاء کے اندر اب بھی اندھے کی لاٹھی گھمائے چلے جا رہے ہیں۔ حضرات ایسے دور میں جب کہ Science Vs Religion کا یہ عالم ہو اور ان دونوں کے اختلافات کو Exploit کرنے کے لئے Petty-minded politician اپنے پورے حربے استعمال کر رہا ہو۔ طلوع اسلام کا یہ کھول کھول کر بیان کرنا اور از روئے قرآن ثابت کرنا کہ اسلام مذہب نہیں ہے بلکہ ایک Social Order ہے اس سوشل آرڈر کی Structure کیا ہے۔ سائنس کا مقام اس سوشل آرڈر میں کیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات کس طرح عین دین کے مطابق ہیں اور ان تحقیقات کو جب قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی روشنی میں Apply کیا جائے تو یہ کس طرح انسانیت کی تباہی کے بجائے انسانیت کے لئے باعثِ رحمت بن جاتی ہیں۔ یہ طلوع اسلام کی تعلیم کا بڑا روشن پہلو ہے جس پر جس قدر بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ اے کاش ہمارے پاس اتنے وسائل موجود ہوں کہ ان نظریات کو دنیا کے سامنے اس انداز سے رکھ سکیں جس کے یہ مستحق ہیں۔

طلوع اسلام نے قرآن کے اکثر ایسے گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اگر ساری امت کے سامنے بے نقاب ہو جائیں تو جس بھنور میں اس کی کشتی صدیوں سے پھنسی ہوئی ہے اس سے نکلنے کا فوری راستہ مل سکتا ہے۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے قرآن کی روشنی دکھا کر زمین پر ذاتی ملکیت کے تقدس کو ملیامیٹ کر دیا۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے اس حقیقت کو جو حرف قل العفو میں پوشیدہ تھی نمودار کیا۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے Islamic Ideology کے خط و خال واضح طور پر قوم کے سامنے رکھے۔ درآنحالیکہ قوم کا کوئی بڑے سے بڑا تیس مارخاں پاکستان بننے کے بعد یہ نہ بتا سکا کہ آخر اس مملکت کے حصول کا مدعا کیا تھا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کے نعرے کا مفہوم اگر کسی نے قوم کے سامنے رکھا تو طلوع اسلام اور صرف طلوع اسلام تھا۔ وحدت امت کا مفہوم اگر کسی نے قوم کو سمجھایا تو وہ طلوع اسلام تھا۔ یہ تخیل کہ فرد اپنی تمام صلاحیتوں کو نہ صرف اپنی پرورش بلکہ امت کی پرورش کے لئے صرف کرے۔ اگر فرد ایسا نہیں کرے گا تو نہ صرف اس کی اپنی بلکہ پوری ملت کی ارتقاء رک جائے گی۔ کس قدر حسین اور بلند تخیل ہے اور نوع انسانی کی مشکلات کا کتنا بڑا حل ہے۔ یہ نظریہ کہ بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عدل کا مفہوم ہر فرد کی نشوونما کے پورے مواقع بہم پہنچانا ہے اور احسان کا مفہوم جہاں کسی فرد کی نشوونما میں کمی رہ جائے اس کو پورا کرنا ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا کتنا انقلاب انگیز پہلو ہے یہ کہ اسلامی مملکت میں مقصود بالذات مستقل اقدار کا تحفظ ہے اور یہ کہ Secular State کا مقصود ملک اور قوم کا تحفظ ہے چاہے اس

مقصد کے حصول کے ذرائع کچھ بھی ہوں۔ یہ کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے اپنی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ کہ انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی وجہ سے واجب التکریم ہے۔ یہ کہ ہر شخص کے مدارج اس کے ذاتی جوہر اور کام کی رو سے مقرر ہوتے ہیں۔ یہ کہ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو قانون خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہو۔ یہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے سے اپنا حکم منوائے حکم صرف اللہ کا ہے۔ یہ کہ کتاب کی وارث ساری امت ہے چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ساری امت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عملی انتظام کی سہولت کے لئے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر فیکم رسول کے سلسلے کو قائم رکھتی ہے۔ اور یہ کہ رسول ﷺ کی زندگی کے بعد فیکم رسول سے مراد ملت کی مرکزی Authority ہے جو رسول کا فریضہ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے اور یہ کہ پیشوائیت کی Institution کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ کتنے بڑے حقائق ہیں جن سے اگر قوم کو کسی نے آشنا کیا تو صرف طلوع اسلام نے کیا۔

دوسری طرف قرآن کا یہ گوشہ کہ وحی کا سلسلہ صرف انبیاء تک محدود ہے۔ اور یہ کہ عام انسانوں کا تعلق صرف خدا کے قانون کے ساتھ ہے، براہ راست خدا کے ساتھ نہیں۔ یہ ان تمام چور دروازوں کو بند کر دیتا ہے جن کے ذریعہ خود ساختہ نبی، اولیاء، پیر فقیر حشرات الارض کی طرح نمودار ہوتے ہیں اور ملت کے جسم کے ساتھ جونکوں کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوس چوس کر نڈھال کرتے رہتے ہیں۔ طلوع اسلام کی آواز سب سے پہلی آواز ہے جس نے تاریخ کے ان بھیانک پردوں کو تار تار کیا جن کے اندر صدیوں سے اسلام چھپا تھا۔

حضرات! یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ یہ قرآن کے گوشے بڑی مدت کے بعد بے نقاب ہو کر سامنے آئے ہیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم لوگ اس دور میں پیدا ہوئے جب قرآن کی روشنی پر سے بادل چھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔ جب قرآن مسجد کے طاقوں اور غلافوں کے اندر سے نکل کر Intelligentsia کے Study-rooms میں پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔ اسے ملتِ اسلامیہ پر پھر سے بہار کا آغاز سمجھئے۔ لیکن پھول کھلنے تب شروع ہوں گے جب ہم سب مل کر ہمت اور استقلال کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں گے۔ جب ہم اپنی حالت خود بدلنے پر آمادہ ہو جائیں گے تو رحمتِ ایزدی یقیناً ہمارے شاملِ حال ہوگی۔ والسلام۔